۱۶ جنوری ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۲

پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمودالحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ـ۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱ـ۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور وفکر کے لیے اہم یا مفید ہوسکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

حماس
اسرائیل
مُعاہدہ

حماس نے سب کو پسپا کر دیا

منصور جعفر

غزہ میں اسرائیل کی جنگ ۱۵/ماہ کے بعد جنوری ۲۰۲۵ء کو اپنے انجام کی طرف بڑھ گئی ہے۔اس کا یہ انجام اس معاہدے کے نتیجے میں ہوا ہے جو اسرائیل اور سب سے بڑے فلسطینی مزاحمتی گروپ حماس کے درمیان ثالثوں کی مدد سے ہوا ہے۔

معاہدے کے دو اصل فریق اسرائیل اور حماس ہیں۔ اسرائیل نے اس معاہدے پر ثالث ملکوں کو اپنی آمادگی سے آگاہ کر دیا اور بعد ازاں اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کوئی گھنٹوں تک حماس کی طرف سے سگنل کا انتظار رہا۔ اس دوران ایسے بھی محسوس ہوا کہ حماس اس معاہدے کو قبول کرنے میں دیر لگا رہا ہے۔اس دیری سے پیدا ہونے والی اسرائیلی تشویش کا اظہار نیتن یاہو کے دفتر نے ۱۵/جنوری کو رات گئے ایک بیان میں بھی کیا کہ 'ابھی تک حماس نے معاہدے کے متن میں دی گئی تجاویز کا جواب نہیں دیا ہے'۔

اس معاہدے کی تفصیلات اور کئی جزئیات بھی سامنے آچکی ہیں۔ یقیناً ان سطور میں ان تفصیلات کی اہمیت کے پیش نظر ذکر ہوگا مگر شروع میں کچھ ایسی باتیں جو اس معاہدے سے پہلے کے حالات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں۔تاکہ حقائق کے ساتھ آگے کا سفر ممکن رہے۔

سات اکتوبر ۲۰۲۳ء سے شروع ہونے والی یہ جنگ ۱۵/ماہ سے زیادہ جاری رہی ہے مگر سال ۲۰۲۴ء کے ابتدائی مہینوں میں ہی اسرائیل کے سب سے بڑے اتحادی اور سرپرست، امریکا کے فوجی وسفارتی اعلیٰ حکام اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اسرائیل کے لیے یہ جنگ جاری رکھنا محال ہوسکتا ہے، اس تاثر کا اظہار پچھلے سال مارچ میں بالعموم امریکی حکام کرنے لگے تھے۔

دوسری جانب اس تناظر میں امریکا کی کوشش یہ رہی کہ اسرائیل کو اس جنگ کے لڑنے کے قابل بنانے کے لیے مزید جو کچھ کیا جاسکتا ہے، وہ سفارتی وعسکری میدانوں میں کر گزرا جائے۔مگر اسرائیل کی اس جنگ کو پھیلنے نہ دیا جائے۔اسرائیل اس سے مزید الجھ جائے گا اور مشکلات بڑھ جائیں گی۔

اس تجربے کی بنیاد پر امریکی حکام اسرائیل کو رفح پر حملے سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ امریکی جو بائیڈن انتظامیہ نے ازخود جنگ بندی معاہدے کے لیے ایک فارمولہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

امریکا کے عسکری وسفارتی تجزیہ کاروں کی یہ بھی کوشش رہی کہ جنگ لبنان کی طرف بھی وسعت اختیار نہ کرے اور کسی طرح اس جنگ کو غزہ کے اندر تک محدود رکھا جائے۔اس سلسلے میں بھی اسرائیل کی وہ 'ضرورتیں' پوری کر دی جائیں اور کسی طرح غزہ سے اسرائیل کو فتح مند نکالنے میں مدد کریں۔

تین امریکی اقدامات اسی پس منظر میں تھے۔اسرائیل رفح پر حملہ نہ کرے۔ لبنان تک جنگ کو پھیلانے سے رکا رہے۔ غزہ میں اسرائیل کی فضا وسمندر سے مدد کی جائے۔نیز سفارتی میدان میں اسرائیل کو درپیش چیلنجوں کا توڑ کیا جاتا رہے۔

اس سلسلے میں امریکا نے کچھ عملی اقدامات بھی کیے۔رفح پر حملے سے روکنے کے لیے علامتی طور پر ہی سہی، اسرائیل کو محدود تعداد میں بموں کی ترسیل روک دی۔ لبنان کی حکومت اور اسرائیل کے درمیان معاملات سیدھے رکھنے کے لیے امریکی نمائندے آموس ہوچسٹن کو فعال کر دیا۔

اُدھر غزہ سے جڑی سمندری حدود میں امریکی بحریہ کی سرگرمیوں کو فعال کرتے ہوئے امداد کے نام پر ایک عارضی بندرگاہ بھی قائم کر دی۔ جبکہ سلامتی کونسل میں اسرائیل کو مکمل حمایت دیے رکھی۔لیکن اسرائیل کو 'فیس سیونگ' دینے کے لیے صدر جو بائیڈن نے ایک مرحلہ وار جنگ بندی کا فارمولہ بھی پیش کر دیا۔

۱۵/جنوری کو سامنے آنے والے معاہدے کے ساتھ ہی یہ سوال اٹھنا اور بحث شروع ہونا بھی فطری امر ہے کہ اس معاہدے سے کامیابی کس کو ملی؟ شکست کس کے نام ہوئی؟ اس پر آنے والے دنوں میں امریکی ویورپ کے حکومتی ایوانوں کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ میں بحثیں ہوں گی اور دُور کی کوڑیاں لائی جائیں گی۔خود ہمارے ایشیائی ذرائع ابلاغ اور قائدین سیاست بھی اپنے اپنے انداز سے نکتہ آفرینیاں کریں گے۔ان کا انتظار بھی رہے گا۔لیکن ان سطور میں چند بنیادی نکات حوالے کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔تاکہ آنے والے دنوں کی سفارتی، سیاسی اور سماجی مہمات کی آندھی سے پہلے کچھ حقائق بہرحال قارئین کے پیش نظر رہیں۔

اندرونی صفحات پر

- مودی سرکار کے لیے نیا دردِ سر
- پاک افغان سرحد کا مخمصہ
- یورپ میں مسلمان ناقابلِ قبول رہیں گے؟
- بنگلا دیش: شیخ حسینہ کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ
- صہیونیت اپنے حتمی مرحلے میں
- امریکا کو قانونی تارکینِ وطن کا انتظار

امریکا اسرائیل کا ازلی ہی نہیں، سب سے بڑا اتحادی و سرپرست ہے۔ غزہ کی جنگ میں بھی اس نے اگر اسرائیل کی مدد نہ کی ہوتی تو اسرائیل کا حلیہ کم از کم آج والا نہ ہوتا۔

اس امریکا نے سلامتی کونسل میں کم از کم تین بار جنگ بندی کی قرارداد کو ویٹو کیا ہے۔ لیکن بالآخر اس جنگ بندی کے لیے جتنی دوڑ امریکی حکومت نے لگائی اور آنیاں جانیاں اٹھائی ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔ یہ دوڑیں کیوں لگی ہیں؟ اس بارے میں ایک حوالہ ۷۷ سالہ امریکی خاتون تاریخ دان ہیں، جن کی شہرت کا ایک حوالہ یہود مخالف خصوصی ایلچی کا بھی رہا ہے۔ ان کا نام ڈیبورا ایستھر پسیٹڈ ہے۔ وہ ۱۵/جنوری کو اس جنگ بندی معاہدے کے بعد چیخ اٹھی ہیں۔ وہ چیخ اٹھی ہیں ’ہم نے یہ جنگ جیتی نہیں ہے۔‘

اسرائیلی کابینہ کے اہم رکن اور وزیر خزانہ بذالیل سموٹریچ اس معاہدے کے اعلان سے محض چند گھنٹے قبل یہ پکار پکار کر کہتے رہے، ’یہ معاہدہ اسرائیل کے لیے تباہی ہوگا۔‘ اسرائیلی کابینہ کے ایک اور اہم وزیر ایتمار بین گویر ہیں۔ اسرائیل کی داخلی سلامتی کے وزیر ہونے کی وجہ سے اسرائیلی انٹیلی جنس کی طرف سے ملنے والی معلومات اور جائزے ان کی نظر سے بلاشبہ اوجھل نہیں ہوسکتے۔ ان ساری سہولتوں کی بنیاد پر یہ حکومت کو ۱۵/جنوری کی صبح تک خبردار کرتے رہے کہ ’حماس کے ساتھ معاہدہ نہ کیا جائے۔ اگر معاہدہ کیا تو حکومت سے الگ ہوجاؤں گا۔‘

اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو بھی کوئی آسانی سے اس طرف آنے والے تو بہر حال نہیں تھے۔ انہوں نے ۱۵/ماہ تک اپنی ریاست کو جنگ میں جھونکے رکھا ہے۔ بدترین معاشی تباہی برداشت کی ہے۔ وہ ۱۵/ماہ تک غزہ میں اسرائیلی قیدیوں کی بے بسی اور ہلاکتوں سے بھی تجاہل عارفانہ برتتے رہے۔ ان کے لواحقین کا اس ساری جنگ کے دوران تل ابیب کی سڑکوں پر ہفتہ وار احتجاج نظرانداز کرتے رہے اور حماس کے ساتھ معاہدے سے گریزاں رہے۔

اگرچہ ان کے سابق وزیر دفاع اور جنگی جرائم میں ان کے سب سے زیادہ قریبی ساتھی یوآو گیلنٹ بھی واضح مؤقف رکھتے تھے کہ ’جنگ یرغمالیوں کی رہائی کا واحد طریقہ نہیں ہے۔ حماس سے ڈیل کرنا ہوگی۔‘

یوآو گیلنٹ تو یہاں تک کہہ چکے تھے کہ ’سارا بوجھ فوج پر نہ ڈالا جائے۔ یرغمالیوں کی رہائی کے لیے کچھ اور کوششیں بھی کی جائیں‘ لیکن نیتن یاہو جنہوں نے ۲۰۲۳ء میں کہا تھا، ’حماس کا وجود نہیں رہے گا‘ ۲۰۲۵ء پر میں اسی حماس کے ساتھ معاہدہ ہونے کے لیے ۱۵/جنوری کو اپنے دفتر میں حماس کے جواب کے لیے بے چین بیٹھے تھے۔

گویا حماس ۲۰۲۵ء تک بھی پورے مزاحمتی قد کاٹھ اور نظریاتی طمطراق کے ساتھ اسرائیل کے سامنے ایک مکمل فریق کے طور پر موجود ہے۔ اس تبصرے اور تجزیے سے گریز کے ساتھ کہ شکست کس کی ہوئی اور فتح مندی سے کون بہرہ ور ہوا۔ اسرائیل اور حماس کے ظاہر کردہ ان اہداف کا ذکر ضروری ہے جو اس کے قائدین کے بیانات کی صورت سامنے آتے رہے۔ پہلے اسرائیل کی بات کرلیتے ہیں۔

اسرائیل نے تین بنیادی اہداف غزہ جنگ کے پس منظر میں جنگ کے پہلے چھ ماہ تک تواتر کے ساتھ بیان کیے۔ البتہ بعدازاں رستے کی تھکن دیکھ کر اسرائیلی قیادت کو سمجھ آنے لگی تھی، اس لیے ان پر زور دے کر اور انہیں نمایاں کرکے بیان کرنے کا سلسلہ جاری ماند پڑ گیا۔

تین اسرائیلی اہداف یہ تھے کہ اس وقت تک جنگ نہیں روکیں گے جب تک یرغمالی رہا نہیں کرالیتے، حماس کا خاتمہ نہیں کرلیا جاتا اور غزہ سے آنے والے وقتوں میں ایسے کسی خطرے کا امکان ہی ختم نہیں کردیا جاتا۔

اسرائیل کی بدقسمتی ہے کہ اس کے پاس ۱۵/جنوری ۲۰۲۵ء کو کیے گئے اس جنگ بندی معاہدے کا ذکر کرنے یا اس کے ارکان کی تمہید باندھنے کے لیے ان تینوں اہداف میں سے کسی ایک کے حاصل کرلینے کا فخر موجود نہیں تھا۔ اسی لیے تو یرغمالیوں کی رہائی کے لیے بالآخر حماس کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا۔ حماس کے مطالبات اور شرائط کو قبول کرنا پڑا۔ رہی بات اسی خطرے کے مستقبل میں خاتمے کے تیسرے ہدف کے حصول کی تو وزیر خزانہ اسموٹریچ اس معاہدے کو اسرائیل کی تباہی قرار دے چکے ہیں۔

حماس کے سات اکتوبر کو اسرائیل پر حملے کے اہداف کا احوال اس کے میڈیا کے ذریعے سامنے آنے والے بیانات میں اس طرح ہوتا رہا۔ اولاً یہ کہ اس کے پاس اپنے عرب اور اسلامی برادران کو اسرائیل کے قریب جانے اور اسے تسلیم کرنے سے روکنے کے لیے کوئی اور آپشن نہ بچا تھا۔ اس لیے اس نے پورے غزہ کی طرف سے اسرائیل اور اس کے ساتھ ’نارملائزیشن پر خودکش حملہ‘ کردیا۔ بلاشبہ حماس کے اس حملے سے غزہ کی تباہی اور قربانی تو ایسی ہی رہی کہ جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔ مگر سعودی عرب اور پاکستان ایسے اہم اسلامی ملک اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے لیے دباؤ کی فضا سے ضرور نکل آئے۔

حماس کے میڈیا کے ذریعے سامنے آنے والے بیانات اور دعوؤں میں یہ بھی کہا جاتا رہا کہ اس حملے کے ذریعے انہوں نے مسئلہ فلسطین کی جانب عالمی برادری کی توجہ مبذول کرانے کا فیصلہ کیا تھا کہ بصورت دیگر یہ اہم معاملہ پس پشت چلا گیا تھا۔ بلاشبہ آج مسئلہ فلسطین جس قدر عالمی برادری کے سامنے اجاگر ہو چکا ہے، ماضی کی تین چار دہائیوں میں اس کی امید باقی نہ رہنے دی گئی تھی۔

۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے کے بعد بے رنگ اور بے اثر قسم کی فلسطینی اتھارٹی کے قیام کے علاوہ ایک ایک کرکے مسلم و عرب ملکوں کا اسرائیل کو تسلیم کرتے جانے کی طرف مائل ہو جانا۔ فلسطین کاز کے لیے تباہ کن ثابت ہو رہا تھا۔ سات اکتوبر کے بعد جب اپریل مئی میں اسرائیل اور اس کے سرپرست و اتحادی سخت مشکل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، یورپ کے تین ملکوں نے فلسطینی ریاست کی آزادانہ حیثیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کردیا۔

حماس نے ۱۵/ماہ سے زائد کی اس جنگ میں بیشمار اور بے پناہ قربانی دے کر اپنے اہداف حاصل کرلیے ہیں۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل کونسل کے اجلاس میں فلسطین کا مسئلہ ایک زندہ و جاوید ایشو کے طور پر ایسے سامنے آیا کہ باہم عالمی برادری کا دل فلسطینیوں کے ساتھ دھڑکتا ہوا نظر آنے لگا۔ امریکا اور یورپ کے تمام بڑے شہروں ہی نہیں، ان ملکوں کی جامعات کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات میں جس بیداری کی لہر سامنے آئی اس نے پورے عالمی نظام کی کھوکھلی جڑوں کو ہلانا شروع کردیا ہے۔

طوالت سے بچنے کے لیے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے اس ابتدائی ردعمل کا حوالہ کافی ہوگا جس میں انہوں نے سات اکتوبر ۲۰۲۳ء کے حماس کے حملے کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسرائیل سمیت اس کے سارے سرپرستوں کو یاد دلایا کہ ’یہ سب اچانک نہیں ہوگیا‘ سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیریس کا یہ ایک جملہ پوری دنیا کے بے ضمیروں کے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھا۔

گویا حماس نے ۱۵/ماہ سے زائد کی اس جنگ میں بیشمار اور بے پناہ قربانی دے کر کم از کم یہ دونوں اہداف حاصل کرلیے ہیں۔

حماس نے اسرائیل اور اس کے سرپرست و اتحادیوں کی تمام تر اسلحہ سامانی کے مقابلے گھریلو ساختہ اسلحے کے ذریعے ایسی دلیری و بہادری دکھائی ہے کہ سب کو پسپا ہونا پڑا۔ کسی کو جنگی محاذ سے اور کسی کو سفارتی محاذ سے۔

اس کامیابی کو فی الحال ۱۵/اگست ۲۰۲۱ء کو کابل میں نظر

آنے والے منظر نامے سے تو نہیں جوڑا جا سکتا کہ افغان طالبان کے ساتھ ظاہراً نہ سہی باطناً پاکستان کے سیکولر قسم کے فوجی سربراہ جنرل پرویز مشرف کی مشہورِ زمانہ 'ڈبل گیم' کا بڑا دخل تھا۔ اور بھی قوتیں اپنے اپنے انداز میں کچھ حصہ ڈال رہی تھیں۔ مگر غزہ تو ایک زیرِ محاصرہ پٹی تھی، جہاں اسرائیل یکطرفہ بمباری کیے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود ۱۵/جنوری ۲۰۲۵ء کا معاہدہ لاس اینجلس کی آگ سے زیادہ طاقت سے سامنے آ گیا۔

اس ۱۵/جنوری کے اسرائیل حماس معاہدے کے بعد اسرائیل کے لیے کیا پیغام ہے؟ اس کے سرپرستوں کے لیے کیا سبق ہے؟ اسرائیل کے کسی مجہول اتحادی یا دوست اور تعلق و شراکت دار کے لیے کیا معنی ہیں؟

اسے بیان کرنے کے لیے بھی اختصاراً اسرائیلی فوج کے ترجمان ریئر ایڈمرل ڈینیئل ہگاری کے اس تاریخی اعتراف کا حوالہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 'حماس ایک نظریہ ہے، اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہنا کہ ہم حماس کو مٹانے جا رہے ہیں، لوگوں کی آنکھوں میں ریت جھونکنے کے مترادف ہے۔ اگر ہم کوئی متبادل پیش نہ کر سکے تو حماس پھر سے ہمارے سامنے ہی موجود ہوگی۔'

دلچسپ بات ہے کہ جب ۱۹/جون ۲۰۲۴ء کو ریئر ایڈمرل ڈینیئل ہگاری نے بطور فوجی ترجمان یہ بیان دیا تو اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کے دفتر سے جاری کیے گئے وضاحتی بیان میں اس فوجی 'اعتراف' کو مسترد کر دیا گیا۔ جواب الجواب میں اسرائیلی فوج نے پھر کہا، 'ہگاری نے حماس کو ایک نظریے کے طور پر بیان کیا ہے۔ جو واضح ہے اور بالکل صاف بات ہے۔'

یہ حقیقت تسلیم کرنا ہی دراصل کسی درست فیصلے اور سمت کی طرف بڑھنا ہو سکتا ہے۔ اسرائیل کی حکومت نے جس حقیقت کو ۱۵/ماہ کی جنگ کے بعد تسلیم کیا ہے۔ اسرائیل کے علاوہ قوتوں نے اسے یہ پہلے باور کرانا شروع کر دیا تھا۔

اب ایک راستہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس معاہدے پر بھرپور اور صدقِ دل سے عمل کیا جائے۔ جیسا کہ سیکرٹری جنرل انتونیو گوتریس نے کہا ہے کہ 'اسرائیل اور حماس کے درمیان معاہدے کو جلد مکمل کرنا چاہیے۔ کیونکہ کوئی بھی جواز فلسطینی عوام پر مسلط کی گئی تباہی اور ہلاکتوں کو درست قرار نہیں دے سکتا ہے۔'

دوسرا راستہ وہ ہے جو اسرائیل کے وزیر اعظم نیتن یاہو نے ۱۶/جنوری کی صبح تین بجے کے بعد اپنے دفتر کی طرف سے جاری کردہ بیان میں اجاگر کیا ہے۔ 'اسرائیل حماس کی طرف سے دی گئی فلسطینی اسیران کی رہائی کی فہرست کو ویٹو کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔'

بلاشبہ وعدہ خلافی اور کہہ مکرنی کی تاریخ اسرائیل سے زیادہ اچھی کس کی ہوگی۔ اسرائیل کے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے بارے میں رویے سے لے کر اوسلو معاہدے تک اور بعد ازاں تازہ ترین مثال لبنان کے ساتھ ۲۷ نومبر کو ہونے والے جنگ بندی معاہدے تک میں، ہر جگہ اسرائیل معاہدے کی خلاف ورزیوں میں پہل کرتا ہے۔

اس لیے اگر غزہ میں جنگ بندی اور قیدیوں کی رہائی کے لیے معاہدے پر عمل معاہدے کی روح کے مطابق نہ کیا گیا اور اسی طرح کی ویٹو کرنے والی مینگنیاں دودھ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی تو پورے مشرق وسطیٰ کو جنگ کے خطرے میں جھونکے رکھنے کے مترادف ہوگا۔

امریکی وزیر خارجہ اینٹنی بلنکن نے اپنے تازہ خیالات کے اظہار میں جو دعویٰ کیا ہے اگر یہ درست ہے کہ 'حماس کے جتنے لوگ مارے گئے، اُس نے اتنے ہی مزید بھرتی کر لیے ہیں،' تو یہ اسرائیل کے لیے پہلے سے خطرناک بات ہوگی۔

امریکا و یورپ میں اسرائیلی قیادت کا جو خونی چہرہ غزہ جنگ نے پیش کیا ہے کہ ۴۶۷۰۷ سے زائد فلسطینیوں کی ہلاکتوں میں زیادہ بڑی تعداد بچوں اور عورتوں کی ہے۔ اس پر مستزاد بین الاقوامی عدالت انصاف اسرائیلی فوج کے ہاتھوں فلسطینیوں کی نسل کشی کے بارے میں حکم اور بین الاقوامی فوجداری عدالت کی طرف سے نیتن یاہو اور ان کے سابق وزیر دفاع کے جنگی جرائم کے سلسلے میں وارنٹ گرفتاری عالمی رائے عامہ کے لیے ردعمل ظاہر کرنے کے لیے بہت کافی ہیں۔

اس قدر تاخیر سے ہونے والے معاہدے کو محض صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی تقریبِ حلف وفاداری میں نیتن یاہو کی شرکت ممکن بنانے و دیگر اسرائیلی حکام کے لیے اظہارِ اپنائیت و قبولیت کا موقع بنانے کے لیے استعمال کرنا درست نہیں ہوگا۔ پوری وسعت نظری اور وسعت قلبی کے ساتھ اس معاہدے پر عمل کرنا مشرق وسطیٰ کے ساتھ ساتھ عالمی امن کے لیے بھی اہم ہے۔

جس طرح صدر جو بائیڈن اور نو منتخب صدر ٹرمپ نے اس معاہدے کے کروانے کا کریڈٹ اپنے نام کرنے میں مقابلے کا تاثر دیا ہے، اس پر عمل میں بھی اسی تیزی اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ جو نو منتخب امریکی صدر کی دنیا کے ساتھ بالعموم اور مسلم دنیا کے ساتھ بالخصوص، نئی اور اچھی شروعات کے لیے ضروری ہے۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۶/جنوری ۲۰۲۵ء)

بقیہ: یورپ میں مسلمان ناقابلِ قبول رہیں گے؟

یہ سب کچھ یورپ کے مسلمانوں میں شدید ڈپریشن کا باعث بن رہا ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ صرف انتہائی دائیں بازو کے سیاست دانوں میں نہیں بلکہ یورپ میں مجموعی طور پر مسلمانوں سے متعلق بحث انتہائی تاریک موڑ پر کھڑی ہے۔ کسی زمانے میں یورپ بھر میں یہودیوں کے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا تھا، وہی سب کچھ اب مسلمانوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے۔ آسٹریا کے سیاسی تجزیہ کار فرید حافظ کہتے ہیں کہ یہودیوں کی طرح مسلمانوں پر بھی یہ الزام تواتر سے عائد کیا جا رہا ہے کہ وہ یورپی معاشروں میں فِٹ نہیں ہوتے اور یہ کہ وہ پورے یورپ کے لیے آج بھی اجنبی ہیں۔ جرمنی میں سکونت پذیر انسانی حقوق کے کارکن شاذا الرواحی کا کہنا ہے کہ آج کے یورپ میں مسلمانوں کو ''نیا یہودی'' قرار دیا جا سکتا ہے۔

میں یہ سوچ سوچ کر اپنا دل بہلاتی رہتی ہوں کہ اِس سال تو یہ سب کچھ ختم ہو ہی جائے گا اور یورپ والے نسلی و مذہبی تنوع کے ساتھ جینا سیکھ ہی لیں گے اور انتہائی دائیں بازو کے لوگوں کو کوئی نیا نظریاتی اور ثقافتی کھلونا مل ہی جائے گا اور یہ کہ یورپ کے سیاست دان لاپروائی سے معاشرے کو تقسیم کرنے سے متعلق زہریلے بیانات دینا چھوڑ دیں گے۔

اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں بہت جلد امید ہار بیٹھتی ہوں۔ جب بھی کہیں تشدد یا دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوتا ہے تب ردِعمل شدید ہوتا ہے اور تمام ہی مسلمانوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور تمام معاملات کے لیے انہی کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ ایک دن ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کے لیے یورپی باشندوں کی سوچ بدل جائے گی اور ایسا اُس وقت ہوگا جب زیادہ سے زیادہ مسلمان بولنا سیکھیں گے اور بولیں گے، وہ (چیہیم کے لفظوں میں) سیڑھی پر چڑھ کر بتائیں گے کہ اُنہیں اپنے بنیادی حقوق کا اچھی طرح علم ہے، ہمیں قانون کا بھی علم ہے اور ہم کامیاب ہیں۔ جب ایسا ہوگا تب یورپ میں مسلمانوں کو انفرادی حیثیت میں شہری تسلیم کر لیا جائے گا اور یہ سب کچھ اُن کے تنوع کے باوجود ہوگا۔ تب مسلمانوں کے بارے میں لگی بندھی اور امتیازی نوعیت کی سوچ اپنانے سے گریز کیا جائے گا۔ تب ایسا نہیں ہوگا کہ ہم معاشرے سے ہم آہنگ ہوں یا نہ ہوں، ہمیں قبول کرنے سے انکار ہی کیا جائے گا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Integrate? Europe's Muslims are damned if we do and damned if we don't".
("The Guardian". January 2, 2025)

مُودی سرکار کے لیے نیا دردِ سر

Jumana Shah

دوسری بار امریکا کے صدر منتخب ہونے والے ڈونلڈ ٹرمپ نے غیر قانونی تارکینِ وطن کے خلاف بڑھکیں مار کر بھی ووٹرز کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ امریکا میں تارکینِ وطن کے حوالے سے انتہائی نوعیت کے تصورات اور رجحانات پنپتے رہے ہیں مگر یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ تصورات پروان چڑھائے گئے ہیں۔

امریکا کے ویزا پروگرام سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے والوں میں بھارتی باشندے نمایاں ہیں۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ بھارت میں جدید ترین ٹیکنالوجیز میں مہارت رکھنے والوں کو افرادی قوت کے طور پر برآمد کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ بھارت نے نالج ورکرز بہت بڑے پیمانے پر تیار کیے ہیں اور اُن کے بیرونِ ملک کام کرنے کی صورت میں بھارت کو بہت بڑے پیمانے پر ترسیلاتِ زر حاصل ہوتی ہیں۔ بھارت کو ایک بڑا فائدہ بھی حاصل ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں پر بھارتی باشندوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پاکستان کے نوجوان بھی صلاحیت میں کم نہیں اور مہارت بھی وہ پیدا کر ہی لیتے ہیں مگر بھارتی باشندوں کو اُن پر واضح ترجیح دی جاتی ہے۔ اِس کا ایک بنیادی سبب تو یہ ہے کہ بھارت کو امریکا کے لیے خاصے قابلِ قبول ملک کا درجہ حاصل ہے۔ اور یہ حقیقت بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ بھارتی باشندے بیرونِ ملک کسی بھی معاشرے میں آسانی سے ضم ہو جاتے ہیں اور کام بھی دل جمعی اور دیانت سے کرتے ہیں۔ فرماں برداری اُن کا ایسا اضافی وصف ہے جو اُنہیں ہر ماحول میں قابلِ قبول بناتا ہے۔

پروفیشنلز کے لیے مختص امریکی H-1B ویزا سے مستفید ہونے والے ۲۰ جنوری کو ڈونلڈ ٹرمپ کی تقریبِ حلف برداری کا خاصی بے تابی سے انتظار کررہے ہیں کیونکہ انہوں نے H-1B ویزا کے لیے جو درخواستیں دائر کر رکھی ہیں، اُن کے حوالے سے فیصلہ کن اعلان تو ٹرمپ انتظامیہ ہی کرے گی۔ امریکا میں اس وقت کم و بیش ۷ لاکھ ۲۵ ہزار بھارتی باشندے غیر قانونی تارکینِ وطن ہیں اور اپنے مقدر کے فیصلے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ڈونلڈ نے انتخابی مہم کے دوران بارہا کہا کہ وہ صدر کے منصب پر فائز ہونے کے بعد پہلے ہی دن سے امریکا بھر سے غیر قانونی تارکینِ وطن کی بھرپور ملک بدری شروع کردیں گے اور یہ اقدام اپنی نوعیت کا سب سے منفرد ہوگا، امریکیوں نے اِتنے بڑے پیمانے پر تارکینِ وطن کی ملک بدری دیکھی نہیں ہوگی۔

اس وقت امریکا میں کم و بیش ایک کروڑ ۱۰ لاکھ غیر قانونی تارکینِ وطن ہیں جن میں سے نصف صرف میکسیکو کے ہیں۔ بھارت اور السلواڈور ۷ فیصد کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہیں۔ ٹرمپ نے اپنے پہلے عہدِ صدارت میں سالانہ ۲ لاکھ غیر قانونی تارکینِ وطن کی ملک بدری یقینی بنائی۔ صدر بائیڈن نے آخری سال میں اس اوسط کو یقینی بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

پالیسی ساز اداروں سے وابستہ ذرائع کا کہنا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کی مدتِ صدارت کے پہلے سال کم و بیش ۱۰ لاکھ غیر قانونی تارکینِ وطن کی ملک بدری یقینی بنانے کی کوشش کیے جانے کا امکان ہے۔ بعد میں اس تعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔ امریکا کے ہوم لینڈ سکیورٹی سے متعلق ڈیٹا کے مطابق اکتوبر ۲۰۲۳ء اور ستمبر ۲۰۲۴ء کے دوران ۹۰,۴۱۵ بھارتی باشندوں کو مطلوبہ دستاویزات کے بغیر امریکا میں داخل ہونے کی کوشش کے دوران گرفتار کیا گیا۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق گجرات، پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش سے تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نئی انتظامیہ اِنہیں وطن واپس بھیجتی ہے کیونکہ کسی بھی غیر قانونی تارکِ وطن کو نکال باہر کرنے کے لیے ایک طویل قانونی طریقِ کار کو اپنانا پڑتا ہے۔

غیر قانونی تارکینِ وطن کو خصوصی حراستی مراکز بھیجا جاتا ہے۔ اِنہیں خاصی ناموافق قسم کی قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امریکا میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والوں کو حراستی مراکز میں تفتیش کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی اُنہیں کوئی وکیل کرنے کی اجازت مل پاتی ہے۔ جج کی طرف سے باضابطہ کارروائی اور سماعت کے بعد ہی ملک بدری کا فیصلہ سنایا جاتا ہے اور یوں کسٹم اور امیگریشن حکام کسی بھی غیر قانونی تارکینِ وطن کو ملک سے نکال پاتے ہیں۔ ملک بدری سے قبل متعلقہ ملک یا ممالک کو باضابطہ اطلاع دی جاتی ہے اور ملک بدری اُس وقت ہوتی ہے جب وہ ممالک نکالے جانے والوں کو اپنا شہری تسلیم کریں۔ گزشتہ برس بائیڈن انتظامیہ نے چارٹرڈ پروازوں کے ذریعے ڈیڑھ ہزار بھارتی باشندوں کو ملک بدر کیا تھا۔ خصوصی پروازوں کے اخراجات امریکی حکومت برداشت کرتی ہے۔ جن لوگوں نے اِن غیر قانونی تارکینِ وطن کو امریکا میں داخل کیا ہو، اُنہیں بھی تلاش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ ہاتھ آجائیں تو ملک بدری کے اخراجات اُن سے وصول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وقت امریکا میں ۱۷,۹۴۰ بھارتی باشندے ایسے ہیں جو قانونی کارروائی کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ملک بدر کیے جانے کے منتظر ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ اِن سب کو واقعی فوری ملک بدری کا سامنا ہے۔ ممبئی میں سکونت پذیر امیگریشن کے وکیل اور مشیر سُدھیر شاہ کہتے ہیں کہ بعض قانونی پیچیدگیوں کے باعث امریکی حکام بھی انہیں فوری طور پر نکال نہیں سکتے۔ اس عمل کے لیے مکمل طریقِ کار اپنانا لازم ہے۔ کسی بھی قانونی تقاضے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ سُدھیر شاہ کہتے ہیں کہ ٹرمپ کے وائٹ ہاؤس میں قدم رکھتے ہی ایسا نہیں ہوسکتا کہ جہاز بھر کر بھارتی باشندوں کو امریکا سے نکال دیا جائے۔ امریکا میں غیر قانونی تارکینِ وطن بہت بڑی تعداد میں اس لیے ہیں کہ امریکیوں کو اُن کی ضرورت ہے۔ غیر قانونی تارکینِ وطن بہت کم معاوضے پر بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی معاملے میں اکڑتے بھی نہیں کیونکہ قانونی معاملات کی پیچیدگی کے باعث وہ اکڑنے کی پوزیشن میں ہوتے ہی نہیں۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ جن ریاستوں میں ڈیموکریٹس کی حکومت ہے وہاں غیر قانونی تارکینِ وطن کو ملک بدر کرنے کی مہم کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔ ایسے فیصلے ریاستی سطح پر ہوتے ہیں۔

امریکا میں غیر قانونی تارکینِ وطن بھی قانونی عمل کے ذریعے کام کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ سیاسی پناہ کے لیے درخواست دائر کرنے کے ۱۵۰ دن بعد یہ لوگ قانونی طور پر کام کرنے کے اہل ہوجاتے ہیں۔ بچوں کو اسکولوں میں داخل کیا جاسکتا ہے اور صحتِ عامہ کی سہولتوں سے استفادہ بھی ممکن ہوجاتا ہے۔ چند ایک صورتوں میں تو میڈیکل انشورنس بھی مل ہی جاتا ہے۔ غیر قانونی تارکینِ وطن اپنے اسپانسر کے ساتھ بالعموم تین تا پانچ سال کام کرتے ہیں۔ اس دوران وہ جی بھر کے کام کرتے ہیں، کماتے ہیں، زبان سیکھتے ہیں، امریکا کے عمومی کلچر کے بارے میں خوب جان لیتے ہیں اور پھر اس سے ہم آہنگ بھی ہوجاتے ہیں۔ سیاسی پناہ

باقی صفحہ نمبر ۱۵

پاک افغان سرحد کا مخمصہ

اعجاز حیدر

موجودہ کیفیت

۴ دسمبر ۲۰۲۴ء کو افغانستان کے صوبے پکتیکا کے علاقے بمل میں نام نہاد تحریکِ طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) کے تربیتی کیمپوں پر پاکستانی فورسز کے حملے افغانستان کی رجوعی پالیسی کو منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ یہ حملے پاکستان کی سکیورٹی فورسز پر کالعدم ٹی ٹی پی کے متعدد حملوں کے بعد کیے گئے ہیں۔ کالعدم ٹی ٹی پی، جسے عالمی سطح پر دہشت گرد تنظیم قرار دیا جاسکتا ہے، افغان طالبان کی خودساختہ عبوری حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہی ہے۔ افغانستان کی عبوری حکومت، جسے تحریکِ طالبان افغانستان کہا جاتا ہے، پاکستان کی طرف سے متعدد بار استدعا اور پالیسی میں تبدیلی کے باوجود کالعدم تحریکِ طالبان پاکستان کو غیر مؤثر کرنے سے انکار کیا ہے۔

تحریکِ طالبان افغانستان (ٹی ٹی اے) کی حکمتِ عملی کے تین پہلو ہیں۔ اول وہ پاکستان کے اس موقف کو ماننے سے انکار کرتی رہی ہے کہ کالعدم ٹی ٹی پی پاکستان کے علاقوں میں حملوں کے لیے افغانستان کی سرزمین کو استعمال کرتی رہی ہے، دوم وہ یہ کہتی رہی ہے کہ یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے اور سوم وہ پاکستان سے کہتی رہی ہے کہ وہ کالعدم ٹی ٹی پی سے دوطرفہ بنیاد پر خود مذاکرات کرے۔

ٹی ٹی اے کی پالیسی ہر اعتبار سے غیر معیاری اور ناقص ہے مگر خیر، تنظیم کے (مفادات کے) تناظر میں یہ پالیسی خوب سوچ بچار کے بعد تیار کی گئی ہے۔ دو حقائق معلوم اور فطری ہیں: افغانستان کی سرزمین پر کالعدم ٹی ٹی پی کی موجودگی اور ٹی ٹی اے کی طرف سے اِس دہشت گرد گروپ کے خلاف کچھ بھی کرنے سے انکار۔ پاکستان کی طرف سے ٹی ٹی اے کو کالعدم ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائیاں کرنے پر مائل کرنے کی کوششوں اور ۲۰۲۱ء اور ۲۰۲۲ء میں کابل میں کالعدم ٹی ٹی پی سے پاکستانی حکام کے مذاکرات کے مختلف ادوار ٹی ٹی اے کے قائدین کے بیانات سے واضح ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی اینیلیٹکل سپورٹ اینڈ سینکشنز مانیٹرنگ ٹیم کی رپورٹ بھی افغانستان میں کالعدم ٹی ٹی پی کی موجودگی اور ٹی ٹی اے سے اُس کے رابطوں کو ثابت کرتی ہیں۔ ان رپورٹس میں طالبان اور القاعدہ کے درمیان لنک کو مضبوط اور علامتی قرار دیا گیا ہے۔ رپورٹس یہ بھی کہتی ہیں کہ تحریکِ طالبان افغانستان کی چھتری تلے کئی دہشت گرد تنظیموں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت اور آزادی ملی ہوئی ہے۔ یہ تنظیمیں ٹی ٹی اے کی طرف سے ملنے والی پناہ اور کام کرنے کی اجازت کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں افغانستان سمیت پورے خطے میں دہشت گردی کے خطرے کا گراف بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔

پاکستان کے سول اور فوجی حکام سے متعدد میٹنگز میں ٹی ٹی اے کی قیادت نے کالعدم ٹی ٹی پی کے قائدین اور جنگجوؤں کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے تاہم اُن کے خلاف کچھ بھی کرنے سے اس لیے معذوری ظاہر کی ہے کہ افغان سرزمین پر امریکا کی قیادت میں تعینات بین الاقوامی افواج کے خلاف لڑائی کے دوران اُن کے کالعدم ٹی ٹی پی سے تعلقات مضبوط تھے اور اُن کے درمیان مغربی افواج کے خلاف اشتراکِ عمل ہوا تھا۔ یہ بات اِس حقیقت سے بھی منظرِ عام پر آئی کہ جب مذاکرات کا مرحلہ شروع ہوا تو ٹی ٹی اے نے اسلام آباد کو یقین دلایا کہ اگر وہ کالعدم ٹی ٹی پی سے بات چیت کرنا چاہے تو اس سلسلے میں سہولت کاری کی جائے گی۔

۱۵ راگست ۲۰۲۱ء کو جب ٹی ٹی اے نے کابل پر قبضہ کیا (یعنی حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوچکی) تب پاکستان نے فوری طور پر کالعدم ٹی ٹی پی کے معاملے پر ٹی ٹی اے کی قیادت سے رابطہ کیا۔ اس کے بعد چند ماہ کے دوران حقانی نیٹ ورک کے جنگجوؤں نے (جیسا کہ اعلیٰ سطح کے چند حکام کے انٹرویوز سے معلوم ہوا) کئی معرکوں میں کالعدم ٹی ٹی پی کے جنگجوؤں اور قائدین کو ہلاک بھی کیا۔ حقانی نیٹ ورک کے لیڈر سراج الدین حقانی نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ کالعدم ٹی ٹی پی سے اپنے معاملات معقولیت کے ساتھ درست کرے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ امریکا کی قیادت میں موجود بین الاقوامی فوج کے خلاف معرکہ آرائیوں میں حقانی نیٹ ورک اور کالعدم ٹی ٹی پی کے درمیان اشتراکِ عمل ایک حقیقت ہے۔ اُسی زمانے میں ٹی ٹی اے میں اندرونی سطح پر حقانی، قندھاری اور ہلمندی گروپوں کے درمیان طاقت (اقتدار) کی کشمکش چلی رہی۔ شمالی افغانستان میں ایک اور چھوٹا گروپ بھی فعال تھا جسے غیر پختون طالبان کہا جاسکتا ہے۔ یہ گروپ مشرقی اور مغربی افغانستان کے درمیان تھا۔ آیئے، وہیں چلتے ہیں جہاں سے بات شروع ہوئی تھی۔

افغانستان سرزمین پر پاکستانی حملوں نے جن کو بوتل سے نکال دیا ہے۔ افغانستان نے ان حملوں کی مذمت کی ہے اور افغان وزارتِ خارجہ نے کابل میں پاکستانی سفارتی مشن کے سربراہ کو طلب کر کے احتجاجی مراسلہ بھی دیا ہے۔

اِن رسمی کارروائیوں سے ہٹ کر دیکھیے تو دو معاملات میں اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ ٹی ٹی اے کے وزیرِ اطلاعات و ثقافت مُلا خیر اللہ خیرخواہ نے کہا ہے کہ کالعدم ٹی ٹی پی درحقیقت ٹی ٹی اے کے لیے مہمان کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے ٹی ٹی اے اُس کی حمایت و امداد بند نہیں کرے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ افغانستان کی وزارتِ دفاع نے اپنے بیانات میں (جو سوشل میڈیا پورٹل ایکس پر بھی جاری کیا گیا ہے) کہا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سرحد محض مفروضے کا درجہ رکھتی ہے۔ جنوری ۲۰۲۴ء میں سرحدی اور قبائلی امور کے افغان وزیر ملا نور اللہ نوری نے کہا تھا کہ بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحد محض خیالی نوعیت کی ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے ہم دیکھیں کہ کس طور ٹی ٹی اے کا موقف دھوکے پر مبنی اور جعلی ہونے کے باوجود اچھی طرح سوچ سمجھ کر اپنایا گیا ہے۔ کابل پر حکمرانی کرنے والے دیگر فریقوں کی طرح ٹی ٹی اے بھی بین الاقوامی سرحد کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

ٹی ٹی اے کے کیس میں پشتون قوم پرستی بھی فرقہ وارانہ مذہبیت میں ملفوف ہے۔ سوویت دور سے اب تک سرحدی علاقوں میں آزادانہ نقل و حرکت نے اِسے مزید بڑھاوا دیا ہے۔ کالعدم ٹی ٹی پی نے پاکستان کے مقابل اپنی پوزیشن کو ٹی ٹی اے کے ذریعے مضبوط کیا ہے۔ ٹی ٹی اے نے مذاکرات میں سہولت کار کا کردار ادا کیا ہے تاہم اُس نے پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے لیے کالعدم ٹی ٹی پی کو مضبوط کرنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہے۔ مذاکرات کے ذریعے کالعدم ٹی ٹی پی کو بھی حکومتِ پاکستان کے مقابل (یعنی اُس کی ٹکر کا) فریق بنانے کی بھی کامیاب کوشش کی گئی۔ ایک اور مثال بھی کافی ہوگی۔ کالعدم ٹی ٹی پی نے وفاق کے زیرِ انتظام رہ چکے علاقوں کو خیبر پختونخوا سے الگ کر کے پُرانی حیثیت کی بحالی، اِن علاقوں میں کالعدم ٹی ٹی پی کے کارکنوں کی واپسی اور اِن علاقوں میں پاکستان کے برائے نام نظم و نسق کا مطالبہ کیا ہے۔

سادہ الفاظ میں کہیے تو کالعدم ٹی ٹی پی کو استعمال کر کے ٹی ٹی اے اِن علاقوں کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں تاریخ کے جھروکے میں جھانکنا پڑے گا جہاں اوڈیپس کی ماں اور بیوی جوکاسٹا (سوفوکلیس کے لکھے ہوئے) عالمی شہرت یافتہ ڈرامے اوڈیپس ریکس میں کہتی ہے کہ دانش کے حامل مرد کو عہدِ حاضر کا درست اندازہ لگانے کے لیے ماضی کے تجربے کو بروئے کار لانا ہی چاہیے۔

ماضی پر ایک نظر

قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک افغانستان دریائے سندھ کے مشرقی حصے تک کے پاکستانی علاقے کی ملکیت کا دعویٰ کرتا رہا ہے۔ جغرافیہ کی اصطلاح میں اسے cis-Indus کہا جاتا ہے۔ پاکستان سے ملحق سرحد کے مختلف مقامات کو تسلیم نہ کرنے کے حوالے سے بھی افغانستان ریاستی سطح پر ناہموار پالیسی کا حامل رہا ہے۔ ماضی کی طرف بار بار پلٹنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ یہ مشق ہمیں ٹی ایس ایلیٹ کی ''برنٹ نارٹن'' کا ایک جملہ یاد دلاتی ہے کہ ''جو کچھ رہا ہوگا، وہ محض مجرد اہمیت کا حامل ہے، وہ ایک مستقل امکان کی شکل میں ہے اور قیاس کی دنیا کی حقیقت ہے۔'' ماضی میں خواہ کچھ بھی ہوا ہو، اس وقت پاکستان اور افغانستان کے درمیان موجود سرحد (ڈیورینڈ لائن) بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اور غیر متنازع ہے۔ افغانستان کی طرح سے دریائے سندھ کے مغربی سِرے (بلوچستان) تک کے علاقے پر ملکیت کا دعویٰ دوطرفہ تعلقات اور خود بلوچستان کو بھی شدید نقصان پہنچاتا رہا ہے۔

ماضی کو یاد دلانے کا بنیادی مقصد کابل کے دعووں کو بے بنیاد قرار دینا اور اس ضرورت کی نشاندہی کرنا ہے کہ پاکستان اب اپنی افغان پالیسی نئے سِرے سے ترتیب دے۔

پاکستان نے افغانستان پر بہت زور دیا ہے کہ وہ بین الاقوامی سرحد کو مکمل طور پر تسلیم کرے، پاکستان کے مغربی اور شمال مغربی اضلاع میں خفیہ کارروائیوں کے ذریعے مداخلت سے باز رہے اور مثبت اشتراکِ عمل کے ذریعے بین الاقوامی سرحد کے دونوں طرف آباد قبائل کے لیے نقل و حرکت کو آزاد اور محفوظ بنائے۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو پایا ہے اور پاکستان کو افغانستان سے مستقل نوعیت کے تخریبی اقدامات سے نپٹنے کے لیے سخت تر اقدامات کرنا پڑے ہیں۔

تاریخ اور دیومالائی داستانیں، بالخصوص مذہبی دیومالا پر مبنی داستانیں، لوگوں پر قیامت ڈھا سکتی ہیں۔ صہیونیوں کی آبادکاری کی شکل میں نوآبادیاتی انداز ایک جاری المیہ ہے جس کی جڑیں دیومالائی ماضی میں گڑی ہوئی ہیں۔ اس سے موجودہ زمانے میں آگ بھڑکی ہوئی ہے اور مستقبل کے حوالے سے امکانات بھی خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔

افغان عوام نے مجموعی طور پر وہ استحکام حاصل نہیں کیا تھا جس نے اُنہیں احمد شاہ ابدالی کے مفتوحہ وسیع علاقوں کا نظم و نسق سنبھالنے کی طاقت عطا کی ہو۔ اور نہ ہی وہ مغلوں کی مرتی ہوئی سلطنت یا بادشاہت کی جگہ کوئی اور بادشاہت یا سلطنت قائم کرنے کے قابل ہی ہو سکے تھے۔ مجموعی طور پر قبائلی طرزِ زندگی اور سوچ کے حامل افراد کے لیے اتنی بڑی سلطنت کو سنبھالنا بہت مشکل کام تھا۔ ایسی ہی کیفیت ماضی کے اسکاٹ لینڈ میں بھی تھا۔ فریز رٹیلر جانتا تھا۔ وہ اسکاٹش تھا۔ اب ہم ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کا سبب بننے والے حالات یا کیفیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

جب دُرانیوں نے بارک زئی (محمد زئی) قبائل کے ہاتھوں شکست کھائی اور زیرِ تصرف رقبہ گھٹ گیا تب لڑائی پھیل گئی۔ ۱۸۱۸ء میں دُرانیوں کی حکومت کے خاتمے سے بھی حقیقی امن قائم نہ ہوسکا۔ معاملات ۱۸۲۶ء میں درست ہو سکے جب پائندہ خان کے سب سے چھوٹے بیٹے دوست محمد نے اپنے بھائیوں پر قابو پا کر درانیوں کی بادشاہت کے بچے کھچے حصے پر دعویٰ کیا مگر خیبر تب تک بچا ہی کیا تھا۔

فریز رٹیلر نے لکھا ہے ''دُرانیوں کے دور کے انتشار اور اندرونی لڑائیوں کے دوران، جو ربع صدی تک جاری رہی، یکے بعد دیگرے صوبے مرکزی اتھارٹی سے الگ ہوتے گئے۔ سندھ، بلوچستان، پورے جنوب نے ایرانی سرحد سے غزنی اور بلخ تک یکے بعد دیگرے علیحدگی اختیار کی۔

اب ایک اور بڑا مسئلہ پیدا ہوا جو سِکھوں کی شکل میں تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے دورِ حکومت کے آخری برسوں میں پنجاب کو سِکھوں کے کنٹرول میں جانے دیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ کے دور میں سِکھوں نے افغانستان کے نمائندے کو قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے نے زمان شاہ کو پنجاب واپس آ کر مرکزی اتھارٹی دوبارہ قائم کرنے پر مجبور کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے دارالحکومت کابل سے لاہور منتقل کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ ایسا اس لیے نہ ہو سکا کہ قبائلی سردار کابل سے دور نہیں ہونا چاہتے تھے۔ تب اُس نے لاہور میں سِکھ گورنر تعینات کرنے کو ترجیح دی۔ اب رنجیت سنگھ کی انٹری ہوئی۔

رنجیت سنگھ نے دُرانیوں کی اتھارٹی کے کمزور ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ۱۸۱۸ء تک اُس نے دریائے سندھ اور دریائے ستلج کے درمیان پورے شمالی پنجاب پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۲۳ء کے درمیان رنجیت سنگھ نے اٹک کی لڑائی میں مغربی اٹک اور نوشہرہ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نوشہرہ کی لڑائی نے پشاور کی پوری وادی کو سِکھ راج کے حوالے کر دیا۔ ملک درہ خیبر تک کا کنٹرول اپنے پاس رکھتے ہوئے رنجیت سنگھ نے تھوڑے سے نذرانے کے عوض پشاور کی گورنرشپ سلطان محمد خان کو سونپ دی۔

۱۸۳۷ء میں رنجیت سنگھ اور دوست محمد کی افواج کے درمیان جمرود کے لیے لڑائی تک دوست محمد خان کو افغانستان میں اپنے زیرِ تصرف علاقوں کے لیے اپنوں ہی کی طرف سے غداری کا سامنا کرنے پر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ انگریز اُس کے اور رنجیت سنگھ کے درمیان مصالحت کروائیں۔ یہی سبب ہے کہ سِکھ فوج کو ہرانے اور ہری سنگھ نلوا کو قتل کر چکنے کے باوجود اُس نے پشاور کی طرف بڑھنے سے گریز کیا۔ تب کچھ دن قبل ہی بھارت میں وارد ہونے والے لارڈ آکلینڈ کے نام دوست محمد کے خط نے وسطِ ایشیا کے امور میں انگریزوں کی مداخلت کا دروازہ کھولا۔

دوست نے انگریزوں سے اچھی خاصی خط و کتابت کی۔ کانگریس کی لائبریری میں دوست محمد کی زندگی کے بارے میں اچھا خاصا مواد موجود ہے۔ وہ انگریزوں سے اپنے معاملات میں مداخلت اور مصالحت کا طالب رہا۔ اس نے مارچ ۱۸۵۵ء اور جنوری ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے معاہدے بھی کیے۔ اِن معاہدوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اُس نے افغانستان اور برطانوی راج میں جینے والے بھارت کے درمیان واقع سرحد کو مکمل طور پر قبول کر لیا تھا۔ تب افغان سرحد کا مشرقی سِرا درہ خیبر کے دہانے پر واقع قلعہ علی مسجد تک تھا۔ فرنٹیئر اب اس قلعے میں ایک کمپنی تعینات رکھتی ہے۔

اِن دونوں معاہدوں کا تذکرہ لازم ہے کیونکہ اِن کے بعد ہی ۱۸۹۳ء میں ڈیورینڈ ٹریٹی ہوئی اور یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ افغانیوں کی حکومت اس معاہدے سے بہت پہلے بھی دریائے سندھ تک نہیں تھی۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ۱۸۴۹ء کے بعد افغان فوج نے کبھی پشاور کے نزدیک بھی قدم رکھا ہو۔ ۱۸۵۷ء کے معاہدے کے تحت دوست محمد کے لیے سپاٹ نالی والی چار ہزار بندوقیں اور سالانہ ایک لاکھ روپے کا زرِ اعانت بھی طے کیا گیا۔

افغانوں اور انگریزوں کے درمیان دوسری جنگ کے پہلے معرکے کے بعد ۱۸۷۹ء میں انگریزوں اور افغانوں کے درمیان

گندامک کا معاہدہ ہوا تھا۔ جب انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا تو دوست محمد کا بیٹا شیر علی خان بھاگ نکلا اور اُس کے بیٹے یعقوب خان نے امن کے قیام کی خواہش ظاہر کی۔

گندامک کی ٹریٹی کے نویں شق کے مطابق سبی، کُرم اور پشین کے اضلاع پر افغانستان کی حکمرانی سے دست بردار ہونا قبول کیا گیا اور خیبر اور مچنی کے دروں پر بھی انگریزوں کا راج تسلیم کیا۔ یہ دونوں درے پشاور اور جلال آباد کے درمیان واقع ہیں۔ آزاد قبائل کے درمیان تمام تعلقات اِن دونوں دروں سے جُڑے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ اس معاہدے کے متن میں شامل ہے۔

یہ امن معاہدہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ لوئی کیویگنری کی قیادت میں آنے والے ایک برطانوی مشن کو چند افغان سپاہیوں نے مار ڈالا اور برطانوی سفارت کاروں کی لاشوں نے اس معاہدے کو ختم کر دیا۔ جب عبدالرحمٰن کابل کے تختِ شاہی پر رونق افروز تھا تب اُس نے اعلان کر دیا تھا کہ قندھار اُس کی حکمرانی کے دائرے میں شامل نہیں۔

یعقوب خان کے چھوٹے بھائی اور ہرات کے گورنر ایوب خان کی فوج کے ہاتھوں مائیونڈ کے معرکے میں برطانوی فوج کی شکست نے قندھار پر برطانوی راج کی پوزیشن کو کمزور بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایوب خان کو افغانستان میں ہیرو کا درجہ ملا۔ اُس کا انتقال ۱۹۱۴ء میں لاہور میں ہوا اور پشاور میں اُسے دفن کیا گیا۔ طالبان نے اپنے ترانوں میں مائیونڈ کے معرکے کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۸۹۳ء میں ڈیورینڈ کا معاہدہ

عبدالرحمٰن نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جس نے انگریز راج کے ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحدوں کو مزید سکیڑ دیا اور یوں اُن کا اثر و نفوذ بھی گھٹ گیا۔ معاہدے سے نقشے بھی منسلک کیے گئے۔ امیر عبدالرحمٰن نے باجوڑ، سوات، چترال اور چاغی کے اضلاع پر سے افغانستان کی حکمرانی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے عوض انہیں اسمار، کافرستان اور بیرمل کے علاقے دیے گئے۔ اِس سے قبل ان علاقوں پر افغانستان کی حکمرانی تھی نہ کنٹرول۔ اگر کوئی تعلق تھا بھی تو بس برائے نام۔ مزید یہ کہ ہندوستان کے انگریز وائسرائے کو خراج کی شکل میں سالانہ بارہ لاکھ روپے دیے جانے لگے اور ہندوستان کی حکومت نے اس میں سالانہ ۶ لاکھ روپے کا اضافہ ممکن بنانے کی ذمہ داری قبول کی۔

بیشتر افغان مصنفین اور سیاست دانوں کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ افغانستان نے دریائے سندھ اور ڈیورینڈ لائن کے درمیان واقع علاقے کا بیشتر حصہ ڈیورینڈ ٹریٹی کے بعد کھویا۔ تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا علاقہ ڈیورینڈ ٹریٹی سے بہت پہلے ۱۸۱۰ء اور ۱۸۷۰ء کی دہائیوں کے درمیان افغانستان ہار چکا تھا۔ افغانستان کے ایک مصنف ارون راہی کا کہنا ہے کہ ڈیورینڈ ٹریٹی کے ذریعے افغانستان نے چند علاقے پہلی بار نہیں بلکہ آخری بار برطانوی راج کے حوالے کیے۔

افغانستان اور ہندوستان کے بعض مصنفین اور تجزیہ کاروں کا یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ ڈیورینڈ معاہدہ ۱۰۰ سال کے لیے تھا۔ معاہدے کے متن میں ایسی کوئی بات درج نہیں۔ متن کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔ افغانوں کا دعویٰ ہے کہ معاہدے کا جو متن امیر عبدالرحمٰن کو دیا گیا تھا، اُس میں ۱۰۰ سال کا ذکر تھا مگر یہ بات کوئی بھی ثابت نہیں کر سکا۔

یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ امیر عبدالرحمٰن نے ڈیورینڈ ٹریٹی پر شدید دباؤ کی حالت میں دستخط کیے۔ برطانوی تاریخ دان بیرسٹر بیجان اومرانی نے لکھا ہے کہ ڈیورینڈ ٹریٹی کے لیے مذاکرات ایک ماہ تک جاری رہے۔ اس دوران ہندوستان کی حکومت اور سر مارٹائمر ڈیورینڈ کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔ اس خط و کتابت سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریقین میں ہر معاملے پر کھل کر بات ہوئی اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس معاہدے کے نتیجے میں چند ایسے علاقے بھی افغانستان کو ملے جنہیں افغان حکمران ہندوستان کے کنٹرول میں دیکھنا چاہتے تھے۔

اِس وقت جو کچھ بھی اُس حوالے سے میسر ہے، اُس کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس معاہدے کے حوالے امیر عبدالرحمٰن کے جذبات ملے جلے تھے تب بھی اِتنا ضرور ہے کہ یہ معاہدہ مجبوری کی حالت میں نہیں ہوا تھا۔ اُس دور میں الحاق کے حوالے سے کوئی باضابطہ بین الاقوامی قانون موجود نہ تھا۔ شواہد موجود ہیں کہ افغان مہم جُو ہندوستانی علاقوں پر حملے کرتے اور اُن پر قبضہ کر لیتے تھے۔ معاہدے عام طور پر علاقوں پر قبضہ جمانے کے بعد ہی کیے جاتے تھے۔ جرمن قانون دان لاسا اوپنہائم کا کہنا ہے کہ امن معاہدوں کے حوالے سے دباؤ ایک ناگزیر فیکٹر تھا تاکہ جنگ کو موجودہ قوانین کی تبدیلی کے محرک کے طور پر تسلیم اور قبول کیا جائے۔ یہ بات اومرانی نے لاسا اوپنہائم کے مقالے انٹرنیشنل لا سے بیان کی ہے۔

ڈیورینڈ ٹریٹی کے تحت ۱۸۹۳ء میں طے پانے والی سرحدوں کا امیر عبدالرحمٰن کے بیٹے اور جانشین امیر حبیب اللہ نے ۱۹۰۵ء میں طے پانے والے کابل کے معاہدے میں بھی ذکر کیا ہے۔ اس معاہدے کے تحت ڈیورینڈ لائن کو ہندوستان کے ساتھ سرحد کے طور پر قبول کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ امیر حبیب اللہ کے لیے فتح کے مساوی تھا کیونکہ امیر عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد ہندوستان نے افغانستان سے زیادہ رعایتیں طلب کی تھیں اور کابل کو زرِ اعانت دینا بھی بند کر دیا تھا۔ لوئی ڈین کے ساتھ تین ماہ تک جاری رہنے والی خط و کتابت کے ذریعے امیر حبیب اللہ ڈیورینڈ ٹریٹی کے تحت معاملات درست کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ ۱۹۱۹ء میں امان اللہ خان نے کابل کے معاہدے کو منسوخ کر دیا جس کے نتیجے میں افغانوں اور انگریزوں کے درمیان تیسری جنگ ہوئی۔ اس کے بعد راولپنڈی میں ہونے والا معاہدہ مختصر، پیچیدہ اور ناخوش گوار رہا۔ اس معاہدے کے تحت سرحد میں تھوڑی سی تبدیلی بھی کی گئی اور امیر امان اللہ کو یہ تبدیلی قبول کرنے پر مجبور بھی ہونا پڑا۔ درہ خیبر کے مغرب تک جس علاقے کی ڈیمارکیشن برطانوی کمیشن نے نہیں کی تھی، اُس کی ڈیمارکیشن بھی اب کی گئی۔ یہیں حالیہ افغان جارحیت ہوئی ہے۔ معاہدے کے دوسرے اور تیسرے آرٹیکل کے تحت افغانستان کے لیے بعض رعایتیں بھی ختم کر دی گئیں اور امیر امان اللہ کو دی جانے والی گزارے کی رقم بھی ختم کر دی گئی۔

طے شدہ سرحدوں کو پھر تسلیم کرنے اور تجارتی و سفارتی روابط کے قیام کے حوالے سے ۱۹۲۱ء میں پھر ایک معاہدہ کیا گیا۔ اس معاہدے کے آرٹیکل نمبر ۲۴ میں ایک شق دست بردار ہونے کی بھی ہے۔ ۱۹۳۰ء میں افغانستان کے اُس وقت کے حکمران محمد نادر نے اِسے بحال کر دیا۔ افغانستان نے ۱۹۲۱ء میں معاملات سے جو دست برداری قبول کی تھی وہ ۱۹۴۹ء تک برقرار رہی۔ ۱۹۴۹ء میں کابل نے دعویٰ کیا کہ اُس نے ۱۹۲۱ء کے معاہدے سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اعلان یا دعویٰ ڈیورینڈ ٹریٹی کے تحت کیے جانے والے رجوعی دعووں سے بہت مختلف تھا۔

آزادی کے بعد کا ماضی

افغانستان نے ستمبر ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے خلاف ووٹ دیا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ جب تک پشتونوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہ دیا جائے تب تک پاکستان کی شمال مغربی سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کو پاکستان کا حصہ نہ گردانا جائے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں افغانستان نے اپنی منفی رائے واپس لے لی اور دونوں ملکوں نے فروری ۱۹۴۸ء

میں سفارتی تعلقات قائم کر کے سفیر تعینات بھی کر دیے۔

افغانستان کے حکمران ظاہر شاہ نے اپنے انکل سردار شاہ ولی خان سفیر بنا کر کراچی بھیجا۔ سردار شاہ ولی خان اردو بولتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگرچہ پاکستان میں پشتونوں کی اکثریت والے علاقوں پر افغانستان کا دعویٰ تھا تاہم اب وہ اس دعوے سے دستبردار ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں خدمات انجام دینے والے امریکی سفارت کار جیمر اسپین کے بقول پاک افغان تعلقات کا مرکزی نکتہ افغانستان کا یہ مطالبہ ہے کہ پشتونستان اُس کا حصہ ہونا چاہیے اور افغانستان نے خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے پختون اکثریت والے علاقوں اور بلوچستان کے چند علاقوں کو بھی اپنی حدود میں شامل کرنے کی کوشش کی۔

پشتونستان کا اِشو، جو پختونوں کے لیے حقِ خود ارادیت کا معاملہ تھا، بنیادی طور پر رجوعی معاملہ تھا۔ یہ حقیقت تو بالکل واضح تھی کہ اگر ایسی کوئی ریاست معرضِ وجود میں آ بھی گئی تو اُس کی بقا ممکن نہ ہو پائے گی اور بالآخر افغانستان میں ضم ہو جائے گی اور یوں کابل کے گریٹر افغانستان کے خواب کو تعبیر مل جائے گی۔

۱۹۶۳ء میں ایشیا سروے کے لیے اپنے آرٹیکل ''پاک افغان ڈیٹینٹ'' (پاک افغان پُرامن بقائے باہمی) میں کراچی یونیورسٹی میں امریکی تاریخ کے وزٹنگ پروفیسر جارج مانٹیگنو نے لکھا کہ پختون قبائلیوں میں افغان ایجنٹ ایک زمانے تک کام کرتے رہے۔ انہوں نے خطیر رقوم بانٹیں، اسلحہ دیا اور ٹرانزسٹر ریڈیو بھی تقسیم کیے۔ یہ لوگ پختونستان کے لیے جذبات پروان چڑھانا چاہتے تھے۔

مانٹیگنو نے یہ بھی لکھا کہ کابل نے مستقبل کے پختونستان میں افغانستان کے پشتو بولنے والے علاقے شامل کرنے کا عندیہ نہیں دیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ افغانستان دراصل اپنے ماضی کو بحال کرنا چاہتا تھا، اُسے پختونستان کاز سے کچھ خاص غرض نہ تھی۔

اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مئی ۱۹۶۳ء میں تہران میں ہونے والے معاہدے کے بعد پاکستان اور افغانستان کے درمیان پُرامن بقائے باہمی کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ ستمبر ۱۹۶۰ء میں افغانستان کے وزیرِاعظم (اور افغانستان کے حکمران ظاہر شاہ کے کزن) سردار محمد داؤد نے افغان فوج باجوڑ بھیجی تھی جس کے بعد پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں سرد مہری در آئی تھی۔ اس کے نتیجے میں پاکستان اور باجوڑ کے قبائلیوں کو افغان عناصر کو نکال باہر کرنے میں ایک سال لگا تھا۔ داؤد بین الاقوامی سرحد کا کھلم کھلا مخالف تھا۔ وہ پشتونستان کے معاملے میں سخت گیر اور انتہا پسندانہ موقف کا حامل تھا۔ پاکستان نے افغانستان کو چیلنج کیا کہ وہ اپنی حدود میں واقع پختون علاقوں میں ریفرینڈم کروا کے دیکھ لے کہ افغانستان کے پختون افغانستان کا حصہ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں شمولیت کے خواہاں ہیں۔

کابل نے سرحدی تنازعات کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ خفیہ سرگرمیاں جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس نے بہت سا مواد بھی تقسیم کیا ہے۔ اس سے اور کچھ نہ تو ہوا مگر دو باتیں ضرور ہوئیں۔ اول یہ کہ پاکستان کے لیے افغانستان کی سوچ اور پالیسی میں نفی در آئی اور دوسری طرف پاکستان کی افغانستان پالیسی میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ افغانستان کا جھکاؤ واضح طور پر بھارت کی طرف رہا ہے۔ اس جھکاؤ نے پاکستان کو افغان پالیسی نئے سرے سے مرتب کرنے کی تحریک دی ہے۔

ظاہر شاہ کی معزولی

۱۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو سردار داؤد نے ظاہر شاہ کے اقتدار کا تختہ الٹ دیا اور افغانستان کو جمہوری ریاست بنانے کا اعلان کیا ہے۔ یہ سب کچھ خوں ریزی کے بغیر ہوا اور افغان فوج کے بیشتر افسران کی حمایت حاصل رہی۔ داؤد نے پشتونستان کی تحریک کو دوبارہ زندہ کیا۔ انہوں نے پختون اور بلوچ علیحدگی پسندوں کی حمایت اور مدد شروع کی۔ اندرونِ ملک داؤد نے رجعت پسندوں کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔ افغانستان کے بہت سے اعلیٰ افسران پاکستان بھاگ گئے۔ ان میں گل بدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود، برہان الدین ربانی اور عبدالرب رسول سیاف نمایاں تھے۔

میجر جنرل (ر) نصیر اللہ بابر مرحوم تب بریگیڈیئر اور فرنٹیئر کور کے انسپکٹر جنرل تھے۔ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کو، جو اُس وقت وزیرِاعظم تھے، صورتحال کے بارے میں بتایا۔ بارنیٹ ریوبن نے ''دی فریگ مینٹیشن آف افغانستان: اسٹیٹ فارمیشن اینڈ کولیپس اِن دی انٹرنیشنل سسٹم'' میں لکھا ''۱۹۷۴ء میں اسلام پسند پناہ گزینوں کی آمد بھٹو حکومت کے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ پاکستان نے خفیہ طور پر اُنہیں منظم کر کے اُن کی بھرپور معاونت کی۔ یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ دوسری طرف ایران کے بادشاہ محمد رضا شاہ پہلوی کی طرف سے بھی خاصا دباؤ تھا۔ وہ داؤد کو مذاکرات کی میز پر لانا چاہتے تھے تا کہ وہ پختون اور بلوچ علیحدگی پسندوں کی حمایت و امداد کے حوالے سے سَودے بازی پر مجبور ہو۔

میں نے ۱۹۹۸ میں کولمبو کے ریجنل سینٹر آف اسٹریٹجک اسٹڈیز کے لیے ایک رپورٹ کی تیاری کے سلسلے میں نصیر اللہ بابر کا انٹرویو کیا۔ نصیر اللہ بابر نے مجھے بتایا کہ اِن افغان قائدین کو برطانوی دور کے ملٹری پے رول کی طرز پے وظیفہ دیا جاتا تھا۔ نصیر اللہ بابر نے اسپیشل سروسز گروپ کی ایک ٹیم کو افغان جلاوطنوں کو بنیادی انفنٹری ہتھکنڈے سکھانے کا ٹاسک سونپا تھا۔ اس معاملے میں انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ اس پورے معاملے کا علم صرف وزیرِاعظم بھٹو، اس وقت کے وزیرِ خارجہ عزیز احمد اور آرمی چیف جنرل ٹِکا خان کو تھا۔ ۱۹۹۴ء میں نصیر اللہ بابر کو جنوب میں ترکمانستان کی طرف کا روٹ کھولنے کے لیے طالبان کی سہولت کاری کا ٹاسک سونپا گیا۔ ویسے نصیر اللہ بابر کا طالبان (تنظیم) کی تشکیل کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ اس دور کی رپورٹس اور تجزیوں سے اس بات کی مکمل وضاحت ہوتی ہے۔ بعد میں یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ افغانستان کے حکمران داؤد پر دباؤ ڈالنے کی پاکستانی پالیسی کا بنیادی مقصد افغانستان کے معاملات میں مداخلت کرنا نہیں بلکہ داؤد کو دباؤ میں رکھ کر اُسے سرحدی تنازعات پر افہام و تفہیم کے لیے رضامند کرنا اور رجعت پسندانہ پالیسی اختیار نہ کرنے پر مجبور کرنا تھا۔

داؤد نے سوویت یونین سے دور ہوتے ہوئے امریکا، مصر، ایران، پاکستان، سعودی عرب اور دیگر خلیجی ریاستوں کی طرف جھکنا شروع کیا۔ اس وقت کے اقوامِ متحدہ کے انڈر سیکریٹری جنرل برائے خصوصی سیاسی معاملات ڈیگو کارڈووِیز (جنہوں نے سیلگ ہیریسن کے ساتھ ''آؤٹ آف افغانستان'' لکھی)، پشاور میں اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے پناہ گزین کے ڈائریکٹر انجیلو ریزا نیاگم، بارنیٹ ریوبن اور دیگر شخصیت نے لکھا کہ داؤد پر اتنا دباؤ مرتب ہو چکا تھا کہ وہ ڈیورینڈ لائن پر بات چیت اور سودے بازی کے لیے آمادہ ہو گیا۔ بعد میں پاکستان کے سیکرٹری خارجہ کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے ریاض کھوکھر (مرحوم) نے بھی اِس کی تصدیق کی۔ تب وہ نوجوان تھے اور داؤد سے بھٹو کی ملاقات میں اُنہوں نے نوٹس لیے تھے۔

جون ۱۹۷۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو کابل گئے اور داؤد نے اُسی سال اگست میں اسلام آباد کا دورہ کیا۔ بھٹو کی طرف سے نیشنل عوامی پارٹی کے رہنماؤں کی رہائی کے وعدے پر

داؤد نے بھی ڈیورینڈ لائن کو باضابطہ بین الاقوامی سرحد کے طور پر قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔

یاد رہے کہ ۱۹۷۵ء تک بھٹو کو بھی مغربی ایشیا اور جنوبی ایشیا میں سوویت یونین کی بڑھتی ہوئی دلچسپی سے خاصی تشویش لاحق ہو چکی تھی۔ اُس سال جون سے اگست تک بھٹو نے امریکی صدر جیرالڈ فورڈ کو تین خطوط لکھے۔ یہ خطوط بہت پُراسرار نوعیت کے ہیں۔ ۱۷/اگست کے خط میں انہوں نے واضح طور پر لکھا کہ یکم اگست ۱۹۷۵ء کو ہیلسنکی فائنل ایکٹ پر دستخط کے نتیجے میں وسطِ یورپ میں استحکام یقینی بنانے کے بعد سوویت یونین اب مغربی ایشیا (مشرقِ وسطیٰ) اور جنوبی ایشیا پر متوجہ ہوگا۔ یورپ میں سلامتی کا اہتمام کرنے کے بعد سوویت یونین کی طرف سے پاکستان سمیت ایشیا کی چھوٹی ریاستوں پر دباؤ ڈالے جانے کا قوی امکان تھا۔ بھٹو کا کہنا تھا کہ سوویت یونین ایشیا کی سطح پر اپنی پوزیشن اِتنی مضبوط بنانا چاہتا ہے کہ کوئی بھی اُسے چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہ رہے۔ آن لائن فورڈ لائبریری میوزیم سے بھٹو کے تینوں خطوط کا متن حاصل کیا جا سکتا ہے۔

فورڈ نے اپنے جواب میں بھٹو کے نکات کو بنیادی طور پر نظرانداز کیا۔ امریکا نے اُس تبدیلی کو سمجھنے میں بہت دیر لگائی جو چار سال بعد رونما ہوئی اور سوویت افواج نے دریائے آمو پار کرکے کابل پر قبضہ کرلیا۔

بھٹو کو البتہ یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ گھر میں ایک بغاوت اُس کی منتظر تھی۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں بھٹو کو معزول کرنے کے بعد اقتدار سنبھالنے والے جنرل محمد ضیاء الحق نے افغان حکمران داؤد کے ساتھ ہونے والی پیش رفت کو آگے بڑھانے کی ٹھانی۔ انہوں نے پختون اور بلوچ قائدین کو رہا کرنے کے بھٹو کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ داؤد کو انہوں نے الجھائے رکھا۔ وہ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں کابل گئے اور اس کے جواب میں داؤد نے مارچ ۱۹۷۸ء میں اسلام آباد کا دورہ کیا۔

کارڈوویز اور ہیریسن نے لکھا ہے کہ اسلام آباد میں اختتامی پریس کانفرنس میں داؤد نے بتایا کہ ڈیورینڈ لائن سمیت تمام معاملات پر بات چیت ہوئی ہے۔ اور یہ بھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام معاملات درست ہوتے چلے جائیں گے۔ اِن دونوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ داؤد نے افغانستان میں رائے عامہ ہموار کرنی شروع کر دی تھی اور وہ پختون اور بلوچ قائدین سے بھی ملے تھے اور انہیں بتایا کہ پاکستان سے آنے والے تمام سیاسی کارکنوں اور چھاپہ ماروں کو ۳۰/اپریل ۱۹۷۸ء تک افغان سرزمین سے نکل جانا چاہیے۔ نیشنل عوامی پارٹی اور بعد میں عوامی نیشنل پارٹی کے لیڈر اجمل خٹک نے کہا تھا کہ داؤد بے وقوف ہیں اور یہ کہ وہ پاکستان نہیں جائیں گے۔

یہ ڈیڈ لائن بہت دور کی ثابت ہوئی۔ ۲۷/اپریل ۱۹۷۸ء کو داؤد اور اس کی فیملی کو چند اعلیٰ افسران نے (جن کا تعلق پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان سے تھا) ایک بغاوت میں قتل کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ پی ڈی پی اے کے پرچم نامی دھڑے سے تعلق رکھنے والے ایک معروف بائیں بازو کے دانشور میر اکبر خیبر کے قتل کے بعد ہونے والے احتجاج کو کچلنے کے لیے داؤد نے طاقت استعمال کی تھی اور پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کو گرفتار کیا تھا۔

پی ڈی پی اے نے اقتدار سنبھالا۔ افغانستان کی تاریخ کے مطابق قبائلی گروپوں نے مزاحمت کی اور اس کے جواب میں کمیونسٹوں نے بھرپور جابرانہ ''اصلاحات'' کیں۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری لیونڈ بریزنیف کو افغانستان کے امور میں مداخلت کی دعوت دی گئی۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء کو سوویت فوج نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ افغانستان پر سوویت یونین کا قبضہ کم و بیش سوا نو سال رہا۔

پاکستان کی طرف سے افغانستان کو بین الاقوامی سرحد قبول کرنے پر راضی کرنے کی کوششوں کا نئے سرے سے آغاز ہوا۔ پاکستان نے سوچا مجاہدین کی مدد کرنے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ غلط فیصلہ تھا۔ سوویت افواج کے نکل جانے سے ملک میں خانہ جنگی پھوٹ پڑی۔ اس کے نتیجے میں طالبان ابھرے۔ انہوں نے بین الاقوامی سرحد قبول نہیں کی۔ اب یہ مسئلہ پھر سر اٹھا چکا ہے۔ دنیا اس سرحد کو مانتی ہے مگر طالبان کی دوسری حکومت اس کے لیے تیار نہیں۔

موجودہ رفتار پاکستان کے پالیسی آپشنز کی مکمل ٹریٹمنٹ کی اجازت نہیں دیتی۔ لازم ہو چکا ہے کہ دو طرفہ تعلقات کے تمام پہلوؤں کا تاریخ کے تناظر میں جائزہ لیا جائے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے تمام طریقوں پر بھرپور غور کیا جانا ہے۔

ڈیورینڈ لائن بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہے۔ کسی بھی پرانے معاہدے کو بحال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کسی مردہ گھوڑے کو زندہ کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ پاکستان کو اس حوالے سے اپنا موقف ڈٹ کر پیش کرنا ہے اور پوری قوت سے اپنی بات منوانی ہے۔

اس حوالے سے ویانا کنونشن کے مندرجات اور پروویژنز سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس کنونشن کی رو سے کوئی بھی ملک بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحد کو خود نہیں بدل سکتا۔ یہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کے طے کردہ رہنما خطوط کے مطابق بھی ہے یعنی یہ کہ اب آزاد ریاستوں کو وہی سرحدیں قبول کرنی چاہئیں جو آزادی ملنے سے قبل تسلیم شدہ تھیں۔ سات عشروں سے پاکستان جن علاقوں پر متصرف رہا ہے، وہ اب اُسی کے ہیں اور یہ سب کچھ بین الاقوامی قوانین کے تحت تسلیم شدہ ہے۔

پالیسی پر نظرثانی کے وقت کالعدم ٹی ٹی پی کے خلاف انسدادِ دہشت گردی کی کارروائیوں پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ یہ کارروائیاں پاکستان اور افغانستان، دونوں ہی کی سرزمین پر کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دیکھنا چاہیے کہ کالعدم ٹی ٹی پی کے خلاف کہاں کہاں ریاستی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے الگ الگ پالیسی اور حکمتِ عملی درکار ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کو اندرونی ہم آہنگی یقینی بنانے کے بعد ہی بیرونی محاذ پر کچھ کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے جامع پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہی نافذ بھی کی جا سکتی ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"The Durand Line and Afghanistan".
(Daily "Dawn" Karachi. January 12, 2025)

بقیہ: امریکا کو قانونی تارکینِ وطن کا انتظار

کیٹیگری میں رکھ کر اُن کے خلاف قانونی کارروائی کا حکم دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ صدر ٹرمپ نے پیدائش کی بنیاد پر امریکی شہرت دیے جانے کی گنجائش کو ختم کرنے سے متعلق بھی ایگزیکٹیو آرڈر جاری کیا ہے۔ صدر ٹرمپ کہتے ہیں کہ قانونی طریقے سے امریکا آنے والوں کا خیرمقدم ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی ہمیں ضرورت ہے۔ غیرقانونی طور پر امریکا میں داخل ہونے والوں کے لیے رہنے کی گنجائش ہے نہ کام کرنے کی۔ اچھا ہے کہ لوگ غیرقانونی طور پر امریکا آنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اب ہم اُنہیں برداشت نہیں کریں گے۔

۲۰۲۴ء میں یو ایس امیگریشن اینڈ کسٹمز انفورسمنٹ نے بھارت سمیت ۱۹۲ ملکوں کے ۲ لاکھ ۷۱ ہزار باشندوں کو اُن کے وطن واپس بھیجا۔ ۲۰۱۴ء کے بعد یہ امریکا سے غیرقانونی تارکینِ وطن کی سب سے بڑی ملک بدری تھی۔ امریکا میں میکسیکو اور السلواڈور کے بعد غیرقانونی تارکینِ وطن کی تعداد کے حوالے سے بھارت تیسرا بڑا ملک ہے۔

(مترجم: ایم ابراہیم خان)

"We need great people to come to US:
Trump weighs in on H-1B visa debate".
("India today". January 22, 2025)

یورپ میں مسلمان ناقابلِ قبول رہیں گے؟

Shada Islam

آج کا ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کبھی یورپ میں مکمل طور پر قبول کیا جائے گا یا نہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ جو مسلمان یورپی معاشروں سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں اُنہیں قبول کیا جائے یا نہیں بلکہ معاملہ یہ ہے کہ جو مسلمان یورپی معاشروں میں پوری طرح گھل مِل چکے ہیں، ہم آہنگ ہو چکے ہیں، اُنہیں بھی قبول نہیں کیا جا رہا۔

یورپ میں اسلاموفوبیا ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ اب نیا الزام یہ عائد کیا جا رہا ہے کہ جو مسلمان یورپی معاشروں میں اچھی طرح ضم اور ہم آہنگ ہو چکے ہیں، وہ بھی مغرب مخالف تصورات سے پوری طرح جان چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

اگر کوئی شخص یورپ میں مسلمانوں سے مخاصمت کے حوالے سے رپورٹنگ کر رہا ہو تو اُسے اس تعمیم کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا کہ یورپ بھر میں بسے ہوئے ڈھائی کروڑ سے زائد مسلمان یعنی سارے کے سارے مسلمان حد سے زیادہ مذہبی اور جذباتی ہیں، تیزی سے انتہا پسندی اور دہشت گردی کی طرف چل دیتے ہیں، متوازی معاشروں میں رہتے ہیں اور بیشتر خواتین (بالخصوص حجاب لینے والی خواتین) مردوں کی برتری والی ذہنیت کے ہاتھوں دباؤ اور امتیازی سلوک کا شکار ہیں اور یہ بھی کہ تمام مسلمان مل کر یورپ سے سفید فام نسلوں کا صفایا کرنا چاہتے ہیں۔

یورپی حکومتیں تواتر سے مسلمانوں کو ہدایت کرتی رہتی ہیں کہ معاشرے سے مکمل ہم آہنگی پیدا کرو، اپنے اپنے خول سے باہر نکلو، سائے سے نکلو اور یورپ کے روشن و درخشاں مرکزی دھارے کا حصہ بن جاؤ۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ اجنبیت ختم کرو، غیروں کی طرح نہ جیو اور یورپی اقدار کو اپناؤ جبکہ یہ واضح نہیں کہ یورپی اقدار کے نام پر اب بچا ہی کیا ہے۔ بیئر یا شراب پینا اور خنزیر کا گوشت کھانا شاید اب بھی یورپی ثقافت اور اقدار و روایات کا نمایاں ترین حصہ ہے۔ یورپی حکومتیں مسلمانوں پر زور دیتی ہیں کہ تعلیم حاصل کر کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا حصہ بنو، ’’میزبان معاشروں‘‘ کو پوری طرح اپناؤ۔ ہنگری کے وزیرِ اعظم وکٹر اوربان یورپی معاشروں کو مکمل عیسائی قرار دیتے ہیں۔

معاملات بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ یورپی یونین کی فنڈامینٹل رائٹس ایجنسی نے حالیہ تحقیق کے نتیجے میں بتایا ہے کہ یورپی معاشروں میں نصف سے زائد مسلمانوں کو مذہب، رنگ، نسل اور ترکِ وطن کے باعث امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ اب معاملہ زیادہ سنگین اس لیے ہو گیا ہے کہ غزہ کے فلسطینیوں پر اسرائیلی فوج کے مظالم کے لیے یورپ بھر میں مسلمان یورپی حکومتوں کو ذمہ دار قرار دے رہے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں مغرب مخالف سوچ مزید پروان چڑھی ہے۔

اسرائیلی قیادت نے کم و بیش سوا سال کے دوران غزہ کے مسلمانوں پر جو قیامت ڈھائی ہے۔ اِس صورتحال نے یورپ بھر کے مسلمانوں میں اسرائیلی قیادت اور فوج کے خلاف نفرت میں اضافہ کیا ہے۔ یورپ کا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان اگر اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی فوج سے بھی نفرت کا اظہار کریں تو اُسے یہودیوں سے نفرت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔

ہالینڈ کے دارالحکومت ایمسٹرڈیم میں حال ہی میں اسرائیلی فٹبال کلب میکابی تل ابیب کے مداحوں اور مقامی باشندوں کے درمیان خونیں تصادم کے حوالے سے جب میں نے یورپ میں اسلاموفوبیا سے متعلق تازہ ترین رجحانات کے بارے میں تھوڑی سی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یورپ میں اب تک جو عمومی تصورات پائے جاتے رہے ہیں، اُن سے ہٹ کر اب مسلمانوں کے حوالے سے اچھے اور بُرے کی تفریق و تخصیص ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اب تمام ہی مسلمانوں کو ایک لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہے یعنی تمام ہی مسلمانوں کو انتہا پسند اور بہت حد تک ناقابلِ قبول گردانا جا رہا ہے۔ یہ خیال تیزی سے پنپ رہا ہے کہ جو مسلمان یورپی معاشروں میں پوری طرح کھپ چکے ہیں، ہم آہنگی پیدا کر چکے ہیں اور مل کر چل رہے ہیں وہ بھی اُنہی لوگوں کی طرح ناقابلِ قبول ہیں جو اب تک یورپی معاشروں کو دل سے قبول نہیں کر سکے اور یورپی معاشروں کی بنیادی روایات اور اقدار کو نہ صرف قبول نہیں کر رہے بلکہ اُن کے مخالف ہیں۔

ہالینڈ میں جاری پُرجوش بحث و تمحیص بتاتی ہے کہ مسلم مخالف بیانیہ کتنی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے۔ ہالینڈ کی چار جماعتی حکومت کے غیر علانیہ (در پردہ حقیقی) سربراہ اور ڈچ پارلیمنٹ کے مسلم مخالف رکن گیرٹ وِلڈر نے دعویٰ کیا ہے کہ ایمسٹرڈیم کے پُرتشدد واقعات کے ذمہ دار مراکشی ہیں۔ اُس نے دھمکی دی ہے کہ جن لوگوں نے ان واقعات کے حوالے سے اُکسایا، انہیں ملک بدر کرنے کے ساتھ ساتھ شہریت بھی ختم کر دی جائے گی۔ ڈچ وزیرِ اعظم ڈِک شُوف کا خیال اس کے برعکس ہے۔ وہ کہتے ہیں ’’ہمیں (مسلم) بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت اور اُنہیں معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے ذریعے ملک میں یہودیوں سے نفرت ختم کرنی ہے‘‘۔

ہالینڈ کی وزیرِ سماجی بہبود نورا اچھبار (Nora Achahbar) نے چند حکومتی ارکان کی طرف سے نسل پرستانہ ریمارکس کی بنیاد پر استعفیٰ دے دیا۔ چار جماعتی حکومت میں شریک پیپلز پارٹی فار فریڈم اینڈ ڈیموکریسی نے پارلیمنٹ میں ایک تحریک پیش کی ہے جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ وہ ترکِ وطن کے ذریعے ہالینڈ کی شہریت حاصل کرنے والوں کے مذہبی اور ثقافتی پس منظر اور رسوم و اقدار کے بارے میں جامع معلومات کا ریکارڈ رکھے۔

بیانیے کی جنگ کے دوران ٹیلی گراف نامی ڈچ اخبار کے سینئر سیاسی مبصر ویئرڈ ڈُک نے کہا ہے کہ ہالینڈ (اور یورپ کے دیگر ملکوں) کے مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اُن کی فکری ساخت اور مزاج میں یہودیوں سے نفرت اور مغرب سے بیزاری گُندھی ہوئی ہے۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور معاشرے سے اچھی طرح ہم آہنگ مسلمان بھی اس رجحان سے بچے ہوئے نہیں۔

ڈُک کے تبصرے کو بہت سوں نے مسترد کر دیا ہے۔ ان میں مراکشی نژاد ڈچ تاریخ دان نادیہ بورس بھی شامل ہیں جن کا کہنا ہے کہ اس نوعیت کے زہریلے ریمارکس دے کر دراصل مسلمانوں کو مستقل طور پر ایک اجنبی کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے جبکہ وہ معاشرے سے ہم آہنگ ہیں۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی سوچ چھوڑ کر وہ سوچیں جو معاشرہ سوچ رہا ہے اور نظم و ضبط یا تذلیل سے کہیں آگے جا کر اب معاملہ سزا کا ہے۔

یورپی پارلیمنٹ کے ایک ڈچ سوشلسٹ رکن محمد چہیم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی کامیابیوں، کردار اور اثر کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُنہیں اجنبی سمجھا جائے۔

یورپی یونین کے صدر مقام برسلز میں ایک بااثر کمیونی کیشن اسپیشلسٹ نے بتایا کہ مسلمان آج بھی اس بات کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں کہ اُنہیں قبول کر لیا جائے۔ کوئی بھی مسلمان مقامی زبان کتنی ہی روانی سے بولے، کتنی ہی اسناد حاصل کر لے، وضع قطع بھی یورپی باشندوں جیسی بنا لے، کوئی نہ کوئی موقع پرست سیاست دان کسی بھی چیز کی طرف اشارا کر کے کہے گا کہ یہ چیز یورپ کی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتی اور اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔

باقی صفحہ نمبر ۳

بنگلادیش: طلبہ انقلاب اور شیخ حسینہ کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ

تیسری قسط

محمد نصیر الدین

فوج کے ترجمان ادارے نے اس فیصلے کو عوام کے لیے نشر کرنے کی کوشش کی مگر حکومت نے روک دیا۔حکومت کو سمجھ آ گئی کہ فوج حسینہ حکومت بچانے کے لیے مزید ان کا ساتھ نہیں دے گی۔ دوسری طرف طلبہ رہنماؤں کو علم ہو گیا کہ فوج عوام کے ساتھ ہے اور وہ گولی نہیں چلائے گی۔انہوں نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے نئی حکمت عملی ترتیب دی۔اسی طرح حسینہ نے بھی سکیورٹی فورسز کو نئی ہدایات دیں۔ جب ۵ ؍اگست کا سورج طلوع ہوا تو سکیورٹی فورسز نے اسلحہ کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے خوب گولیاں برسائیں۔ ہزاروں طالب علم شہید اور زخمی ہوئے مگر جس قدر شدت سے انہیں ختم کیا جا رہا تھا اتنے ہی طلبہ اور آ رہے تھے۔

پورا دن ڈھاکا میں طلبہ اور عوام پر تشدد ہوتا رہا۔مگر عوام ہار نہیں مانے۔جن چھ طلبہ کو گرفتار کیا گیا تھا ان کے موبائل فون سے ڈیٹا نکال کر ہزاروں طلبہ کو گرفتار کیا گیا۔ان کے گھر والوں کو پکڑ لیا گیا۔ نتیجے عوام اور سکیورٹی فورسز کے درمیان جنگ جاری تھی۔اتنا ظلم و جبر کیا گیا کہ حسینہ کو لگا کہ مظاہرین کو کچل دیا گیا ہے۔طلبہ رہنماؤں نے آپس میں رابطہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ڈھاکا کی طرف مارچ ۶ کے بجائے ۵ کو ہو گا اور فوری طور پر اس کی اطلاع ہر جگہ پہنچا دی گئی۔ ۵ تاریخ کی صبح ہی لوگ ڈھاکا کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ڈھاکا کی تمام سڑکوں پر لوگ ہی لوگ تھے۔

سکیورٹی فورسز کا ظلم بھی عوام کو نہ روک سکا۔ بہت ساری جگہوں پر فوج نے سکیورٹی فورسز کو گولی چلانے سے روکا۔عوام نے فوجیوں کو اپنے کاندھوں پر بٹھا لیا، ان کے ٹینکوں پر چڑھ گئے، ان سے گلے ملنے لگے۔

دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ سکیورٹی فورسز پسپا ہونے لگیں۔ ہر طرف عوام ہی عوام تھے۔ حسینہ واجد اس صورت حال سے بے حد غصے میں تھی۔ تمام افواج اور سکیورٹی ایجنسیوں کے سربراہان کو طلب کیا اور پوچھا کہ وہ سختی کیوں نہیں کر رہے اور ساتھ ہی حکم دیا کہ چاہے جتنی مرضی جانیں اور جائیں مگر وہ حالات کو کنٹرول کریں۔ آئی جی پولیس نے اطلاع دی کہ شہر کا کنٹرول مظاہرین نے سنبھال لیا ہے۔ سکیورٹی فورسز بیرکوں میں چلی گئی ہیں۔فوجی چیف نے کہا کہ فوج نے اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ عوام پر کوئی گولی نہیں چلائے گی۔ باقی سربراہان نے بھی مزید کارروائی کرنے سے معذرت کر لی ہے۔ سب کا کہنا تھا کہ اب مزید خون خرابہ کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔اتنے میں آرمی چیف نے کہا کہ مظاہرین وزیر اعظم ہاؤس سے صرف ۴۰ منٹ کے فاصلے پر ہیں۔آپ نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے فوری کر لیں یا تو عوام کے غیظ و غضب کا سامنا کریں یا پھر فرار ہو جائیں۔حسینہ نے قوم سے خطاب کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔آرمی چیف نے کہا کہ اب وقت نہیں ہے۔لوگ حیران تھے کہ وزیر اعظم ہاؤس سے ایئر پورٹ تک سکیورٹی اتنی سخت کیوں کی گئی ہے۔ ٹی وی سے خبر نشر ہوئی کہ آرمی چیف قوم سے خطاب کریں گے۔ اس سے لوگوں کو اندازہ ہوا کہ حسینہ حکومت کے خاتمے کا اعلان کیا جائے گا۔لوگ پُرجوش ہو کر وزیر اعظم ہاؤس کی طرف دوڑنے لگے۔ادھر حسینہ کی اسپیشل سکیورٹی فورس نے اسے ہیلی کاپٹر سے روانہ کر دیا۔آرمی چیف نے ۲ بجے کے بجائے ۳ بجے خطاب کیا، کیونکہ وہ حسینہ کے فرار کی تیاریوں میں مصروف تھے۔انہوں نے سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے بھی رابطہ کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ جب حسینہ واجد کا ہیلی کاپٹر بنگلا دیش کی حدود عبور کر کے بھارتی حدود میں داخل ہوا، تب آرمی چیف نے قوم سے خطاب کیا۔حسینہ واجد کے استعفیٰ کا اعلان کیا اور ایک نگران حکومت کے ذریعے نئے انتخابات کروانے کا اعلان کیا۔ سڑکوں پر موجود لوگ خوشی سے جھوم اٹھے۔ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور مٹھائیاں تقسیم ہونے لگیں۔ تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں نے آرمی چیف کی دانشمندانہ حکمت عملی پر اطمینان کا اظہار کیا۔

شیخ حسینہ واجد اپنی بہن شیخ ریحانہ کے ساتھ ملک سے فرار ہو کر بھارت چلی گئی۔ یہ ۵ ؍اگست، دن اڑھائی بجے کی بات ہے۔الیکٹرانک میڈیا پر خبر آنا شروع ہوئی کہ آرمی چیف بنگلا دیش عوام سے خطاب کریں گے۔مظاہرین کو اپنی کامیابی کا اس وقت تک یقین ہو چکا تھا اور وہ جشن منانا شروع کر چکے تھے۔ دوسری طرف عوامی لیگ کے رہنما اور کارکنان یہ سمجھ رہے تھے کہ حسینہ واجد نئی حکمت عملی سے مظاہرین سے نمٹنے جا رہی ہے۔ ڈھائی بجے کے خطاب کے لیے لوگ ٹی وی پر نظریں جمائے منتظر تھے کہ اعلان ہوا کہ خطاب تین بجے ہو گا۔ ہر طرف چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ پولیس اور سکیورٹی فورسز راستے سے ہٹ چکی تھیں۔مظاہرین کو یقین ہونے لگا تھا کہ کامیابی ان کی منتظر ہے۔انہوں نے پی ایم ہاؤس کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ٹھیک تین بجے آرمی چیف نے قوم سے خطاب کیا۔انہوں نے قوم کو پرامن رہنے کی تلقین کی اور مزید بتایا کہ شیخ حسینہ وزارتِ عظمیٰ سے استعفیٰ دے کر ملک سے فرار ہو چکی ہیں اور مزید بتایا کہ ایک نگران حکومت فوری تشکیل دی جائے گی جن کی ذمہ داری فیئر اینڈ فری الیکشن ہو گی اور اقتدار عوامی نمائندوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

آرمی چیف کے اعلان کے ساتھ ہی عوام خوشی سے نہال ہو گئے۔ بنگلا دیش کی سڑکیں مظاہرین سے بھری ہوئی تھیں، سب کی امیدیں بر آئیں، جو گھروں میں تھے وہ بھی باہر آ گئے۔لوگ خوش تھے کہ انہیں ظلم و جبر سے آزادی مل چکی ہے۔ پی ایم ہاؤس میں دوپہر کا بہترین کھانا تیار تھا، کیونکہ شیخ حسینہ کو اُمید تھی کہ سکیورٹی فورسز مظاہرین پر قابو پا لے گی۔ سکیورٹی فورسز کے کمانڈرز نے وزیر اعظم کو یقین دلایا تھا کہ ڈھاکا کا شہر کو مکمل سیل کر دیا گیا ہے، یہاں اب کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔حسینہ واجد اپنے کمانڈرز کی باتوں کا یقین کر کے ان سکیورٹی فورسز کے لیے بہترین کھانے کا آرڈر کر چکی تھی، مگر یہ کھانا دراصل ان مظاہرین کا مقدر تھا جو حسینہ کے فرار ہوتے ہی عوام نے خوشی خوشی کھایا۔تین بجے کے بعد عوام کا مکمل طور پر ڈھاکا پر قبضہ ہو چکا تھا۔لوگ ہر طرف خوشیاں منا رہے تھے۔ شہید مینار میں جب لوگوں کو مجیب کا مجسمہ نظر آیا تو مظاہرین نے اس کو ہتھوڑے سے توڑا۔سب مظاہرین نے اپنے اپنے طریقے سے اس پر غصہ نکالا اور بالآخر اس کو مسمار کر دیا۔میڈیا اس کی مکمل کوریج کر رہا تھا۔سب لوگوں نے اس کو دیکھا اور پھر شہر شہر مجیب کی مورتیوں کو توڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا بنگلا دیش مجیب کی مورتیوں سے پاک ہو گیا۔

اگلے دن یعنی ۶ ؍اگست کو پورے بنگلا دیش میں سے ہر دفتر ہر کالج یونیورسٹی سے مجیب اور حسینہ واجد کی تصاویر کو پھاڑ دیا گیا۔کئی تصاویر اکٹھی کر کے آگ لگا دی گئی۔مظاہرین نے عہد کر لیا تھا کہ مجیب اور حسینہ کی تمام کارستانیوں سے بنگلا دیش کو پاک کر دیں گے۔دوسری طرف عوامی لیگ کے لوگ بہت زیادہ پریشان تھے۔ سب کو اپنی اپنی فکر تھی اور وہ اِدھر اُدھر بھاگ کر محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھے۔تمام وزراء مشیر ممبر

پارلیمنٹ چیئرمین سب گھروں سے غائب تھے اور سب کے گھروں میں تالے پڑے ہوئے تھے۔ سب کو اپنے دور میں عوام پر کیے گئے ظلم اور بربریت کی یاد آرہی تھی، سب اپنے آپ کو بچانے کی تدابیر کر رہے تھے۔ عوامی لیگ کے رہنما سکتے میں تھے کہ سب کو چھوڑ کر حسینہ اپنی بہن کو لے کر فرار ہوگئی ہیں۔ کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی کو بتائے بغیر بھاگ جائے گی۔ سب کا کہنا تھا کہ اگر حسینہ کو بھاگنا ہی تھا تو اتنا خون کیوں بہایا۔ عوامی لیگ کے کارکنان کو مظاہرین سے کیوں لڑوایا، اتنے ظلم و جبر کی صرف حسینہ واجد ذمہ دار ہے۔

شیخ حسینہ کے فرار کے بعد بنگلا دیش کی حکومت کن لوگوں پر مشتمل ہوگی۔ نیا سربراہ کون ہوگا، لوگ سوچ بچار کر رہے تھے اور اگلے اعلان کے انتظار میں تھے۔ طلبہ رہنماؤں نے بھی غور و خوض کیا کہ حکومت کا رہنما ایسا ہونا چاہیے جس پر عوام متفق اور متحد ہو، جس کی خوبیوں کو ساری دنیا جانتی ہو تاکہ وہ بھارت سے مقابلہ کر سکے۔ بہرحال ان کی سمجھ میں ایسی شخصیت آئی جو ان کی نظر میں ان تمام خوبیوں کی مالک تھی اور وہ شخصیت ڈاکٹر یونس کی تھی۔ بہرکیف وہ ان کی اچھی چوائس تھی۔ جب اس نام کا میڈیا پر اعلان کیا گیا تو بنگلا دیشی عوام نے اس کو پسند کیا اور اس پر اتفاق کیا۔ طلبہ رہنماؤں نے ڈاکٹر یونس سے بات کی جو اُس وقت فرانس میں موجود تھے۔ انہوں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر یونس کی نامزدگی سے پہلے طلبہ رہنماؤں نے آرمی چیف اور صدر سے میٹنگ کی۔ سب نے اس پر اتفاق کیا۔ اس سے پہلے سب طلبہ رہنماؤں نے واشگاف الفاظ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ کسی صورت میں ملٹری رول (فوجی اقتدار) کو قبول نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر محمد یونس ۸/اگست کو ڈھاکا پہنچتے ہیں اور اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیتے ہیں اور ۱۷/رکنی کابینہ نے بھی حلف اٹھایا۔

ڈاکٹر محمد یونس دنیا کے سات مشہور آدمیوں میں سے ایک ہیں، جن کو نوبل پرائس ملا ہے، انہیں یو ایس کانگریشنل گولڈ میڈل ملا، انہیں یو ایس پریزیڈینشل گولڈ میڈل بھی ملا۔ انہیں دنیا کی بہت سی حکومتوں نے اعزازی تمغوں سے نوازا ہے۔ ۵۰ سے زیادہ یونیورسٹیز نے انہیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ انہیں ۱۱۳/انٹرنیشنل ایوارڈز دیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد یونس ۲۸ جون ۱۹۴۰ء میں چٹاگانگ میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ۸۴ سال ہے۔ وہ ماہر معاشیات ہیں، سیاستدان ہیں اور سول سوسائٹی کے لیڈر ہیں۔ انہوں نے بنگلا دیش میں گرامین بنک (ویلیج بنک) بنایا تھا۔ یہ بنک گاؤں میں چھوٹے چھوٹے قرض دیتا تھا۔ انہوں نے گاؤں میں لاکھوں لوگوں کو قرض دیا۔ ان کے اس خیال اور کوشش کو جو غریب کو چھوٹا قرض دے کر غربت سے نکالنے کا باعث بنا، کی بنیاد پر انہیں ۲۰۰۶ء میں نوبل پرائز دیا گیا۔ ۲۰۰۹ء میں کانگریشنل گولڈ میڈل اور ۲۰۱۰ء میں پریزیڈنشل گولڈ میڈل دیا گیا۔ دنیا کے تمام نوبل پرائز یافتہ لوگ ان کے قریبی دوست ہیں۔ بہت سارے ملکوں کے سربراہان اور اہم شخصیات ان کی ذاتی دوستی میں شامل ہیں اور انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر یونس ۲۰۱۲ء سے لے کر ۲۰۱۸ء تک گلاسکو یونیورسٹی یو کے کے وائس چانسلر رہے ہیں۔

ڈاکٹر یونس ان چند بین الاقوامی شخصیتوں میں سے ہیں جنہیں لوگ سننا پسند کرتے ہیں۔ ان کے تعارف میں اور بھی بہت کچھ ہے، مگر ہم آپ کو بنگلا دیش میں ان کی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے ہیں جیسا کہ آپ کو بتایا کہ انہوں نے ۸/اگست کو حلف اٹھا کر سب کو حیران کر دیا بنگلا دیش کے طلبہ اور عوام سب بہت خوش تھے کہ انہیں ایسا محبِّ وطن رہنما ملا، جن کو دنیا قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان کی دیانت داری اور صلاحیت کی وجہ سے انہیں نوبل پرائز ملا اور ان پر کسی بھی کرپشن کا کوئی الزام نہیں ہے۔ وہ بہت پراثر اور خوب صورت گفتگو کرتے ہیں اور پر پیچ باتوں کی بجائے نہایت سادہ اور سیدھی بات کرنے کے عادی ہیں، ہمیشہ سچ بولنا اور دوسروں سے ادب سے بات کرنا بھی ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ اقتدار سنبھالتے ہی انہوں نے کچھ ایسے حیران کن اقدامات کیے جسے نہ صرف اسلام پسند بلکہ سب لوگوں نے سراہا۔ وہ انتہائی ذہین اور وقت پر فیصلہ کرنے کی بڑی پختہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کے چند فیصلوں کا تذکرہ درج ذیل ہے:

۱) انہوں نے جیل سے تمام علمائے دین کو فوری رہا کر کے ان کے خلاف لگائے گئے بے بنیاد تمام کیس ختم کرنے کا حکم دیا۔ بڑے بڑے جید علمائے دین سے انہوں نے خود فون پر بات کی اور درخواست کی کہ اب آپ کو دین اسلام کی ترویج کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وہ قرآن اور سیرت کی محافل کا انعقاد کریں اور لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ واضح رہے کہ حسینہ حکومت نے علمائے دین پر اجازت کی پابندی لگائی تھی۔ جید علمائے دین نے اپنی دینی محافل میں لوگوں کو اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں گرفتار کر کے ان کو جسمانی ٹارچر کیا۔ ان کے جسموں کے نازک حصوں پر بھی بجلی کے جھٹکے لگائے گئے۔ لاکھوں لوگوں کو حسینہ حکومت کی اس ظلم و بربریت کا علم ہوا تو لوگوں کو حسینہ حکومت اور عوامی لیگ کے کارکنوں سے نفرت میں اضافہ ہوا۔

۲) عوامی لیگ سرکار کے قومی مدارس اور عالیہ مدارس کے خلاف سخت اقدامات کی وجہ سے دونوں درسی نظام سخت بدحالی کا شکار ہوئے۔ ڈاکٹر یونس اور ان کی حکومت نے فوری طور پر ان مدارس کو سرکاری خزانے سے وسائل فراہم کیے اور یوں وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے۔ انہوں نے تمام علمائے دین سے انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں کیں اور توجہ سے ان کے مسائل سنے اور فوری حل کے احکامات جاری کیے۔ ان اقدامات سے علماء نے ڈاکٹر یونس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔

۳) حسینہ واجد نے اگست کی پہلی تاریخ کو حکومت کے خلاف مظاہروں کی تمام ذمہ داری جماعت اسلامی اور اسلامی چھاتر و شبر پر لگائی اور کہا کہ یہی لوگ مظاہرین کو اور اس تحریک کو منظم کر رہے ہیں۔ اس لیے یکم اگست کو انہوں نے ان پر پابندی لگا دی۔ ڈاکٹر یونس نے حکومت میں آتے ہی ان احکامات کو واپس لے لیا اور جماعت اسلامی اور چھاتر و شبر کو بحال کر دیا۔

۴) عوامی لیگ نے اپنے ۱۵/سالہ دورِ اقتدار میں پورے بنگلا دیش میں جماعت اسلامی اور اسلامی چھاتر و شبر کے تمام دفتروں پر تالے لگا دیے تھے۔ یہ لوگ پورے ۱۵/سال سے اپنے دفتروں میں نہیں جا سکتے تھے، ان کو کہیں بھی چھوٹے نہ بڑے کوئی اجتماعات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ آئے دن پولیس ان کے کارکنوں کے گھر آتی اور شک کی بنیاد پر انہیں پکڑ کر لے جاتی۔ پولیس ان پر ظلم کرتی، تھانوں میں رکھتی جیلوں میں بند کرتی۔ ڈاکٹر یونس نے فوری طور پر ان سے یہ پابندیاں اٹھا لیں اور سارے دفتر کھول دیے۔ جماعت اسلامی اور اسلامی چھاتر و شبر نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے دفتروں میں اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا۔

۵) ڈاکٹر یونس نے جیلوں میں قید لاکھوں سیاسی کارکنوں کو رہائی کا حکم دیا، ان پر عائد کیس ختم کرنے کے احکامات جاری کیے۔ عوامی لیگ دور میں ایک ایک کارکن پر کئی کئی کیس اور مقدمات کر دیے گئے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ ان کی اگلی زندگی انہی مقدمات کی پیشیاں بھگتاتے بھگتاتے گزر جائے۔ ڈاکٹر یونس کے ایک حکم سے لاکھوں لوگ جیلوں سے باہر آ گئے۔ ان سب نے اور ان کے گھر والوں نے ڈاکٹر یونس کے ان اقدامات کو سراہا۔

۶) بنگلا دیش کی عوام کو حسینہ حکومت کے خاتمے کے ساتھ بڑے بڑے سرپرائز ملے۔ ہزاروں سیاسی رہنما فوجی آفیسرز، بیرسٹرز، ڈاکٹرز جن کو حسینہ حکومت نے اغوا کر کے مختلف قید خانوں میں بند کر دیا تھا، وہ سب منظر عام پر آ گئے۔ ان کے متعلق حسینہ حکومت عدالت سے جھوٹ بولتی رہی کہ انہیں ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں مگر حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی سب قید سے چھوٹ کر باہر آ گئے۔ ان میں پروفیسر غلام اعظم سابق امیر جماعت اسلامی کا بیٹا بریگیڈیئر جنرل امام اعظمی۔ شہید میر قاسم علی کے صاحبزادے بیرسٹر ارمان، بی این پی کے رہنما غیاث الدین اور صلاح الدین نمایاں ہیں اور بھی سیکڑوں اغوا کنندگان جیل کے اذیت خانوں سے رہا ہوئے اور انہوں نے میڈیا کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستانیں سنائیں اور بتایا کہ وہ آٹھ سے دس سال غائب رہے اور حکومت کا ظلم سہتے رہے۔ میڈیا پر آنے والی ان تمام خبروں کو سن کر عوام حسینہ حکومت کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرتے رہے۔

۷) حسینہ حکومت کے جبر کی وجہ سے بہت سارے صحافیوں، سول سوسائٹی کے لوگوں اور علمائے دین کو ملک چھوڑنا پڑا۔ جو ملک چھوڑ کر گئے ان کی عدم دستیابی کی وجہ سے ان کے گھر والوں پر حسینہ حکومت نے زبردستی کی اور ظلم کیا۔ حسینہ حکومت کے خاتمے کے بعد بیشتر لوگ واپس آئے اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی داستان میڈیا کے سامنے پیش کی۔ دیکھنے والوں کے سامنے سوال تھا کہ کیا حسینہ حکومت اپنی عوام پر اتنا ظلم کر سکتی ہے؟

۸) ڈاکٹر یونس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ انتظامیہ پر قابو پانا تھا۔ یہ لوگ ہر جگہ ہر دفتر میں موجود تھے۔ ان میں R.A.W کے ایجنٹ، ہندو اور عوامی لیگ کے کارکنان بھی تھے۔ جنہوں نے عدم تعاون شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر یونس کے ساتھ ان کے ۱۷ مشیروں نے بھی حلف اٹھایا تھا۔ بیوروکریسی نے سب کے ساتھ عدم تعاون کیا۔ بنگلا دیش میں تقریباً دو لاکھ اسی ہزار پولیس والے تھے۔ سب بھاگ گئے اور پولیس کا ادارہ تقریباً خالی ہو گیا۔ قصہ مختصر تمام بیوروکریسی جس میں کمشنر، ڈپٹی کمشنر، S.P، سول سیکٹریٹ کے افسران سب نے حکومت کے تعاون سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ہسپتال کے ڈاکٹرز نرسیں گویا لگ رہا تھا کہ سارے ادارے عدم تعاون کر رہے ہیں۔ ان سب اداروں میں وہی کوٹہ سسٹم کے تحت لوگ بھرتی کیے گئے تھے۔ اس تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر یونس اور اُن کی ٹیم نے حالات کو بہتر کرنے کے لیے اقدامات کا آغاز کیا۔ ۶۴ جیلوں میں نئے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر تعینات کیے گئے۔ تمام اضلاع میں پولیس سربراہان کی نئی تقرری کی گئی۔

●●●

صہیونیت اپنے حتمی مرحلے میں

اسرائیل کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، اِس بحث سے قطع نظر یہ سوال زیادہ اہم ہے کہ اب اسرائیل کو لگام کس طور دی جاسکتی ہے۔ جو کچھ اُس نے سوا سال کے دوران غزہ میں کیا ہے، اُس کے بعد اس بات کی گنجائش کم ہی رہ گئی ہے کہ اُسے بے لگام رہنے دیا جائے۔ اِس بار اُس نے غزہ کے باشندوں پر قیامت ہی ڈھائی ہے اور اب لازم ہوچکا ہے کہ طاقت کا سامنا بھرپور طاقت ہی سے کیا جائے۔

زیرِنظر انٹرویو میں انتہائی واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اور دوسری طرف صرف طاقت ہی تمام مسائل کے حل کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اسرائیلی قیادت نے اپنی نئی نسل کے ذہنوں میں یہ بات کیل کی طرح ٹھونک دی ہے کہ صہیونیت ہی اُن کی بقا کا راستہ ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ اسرائیل کی نئی نسل کو اس بات کا یقین دلایا جائے کہ وہ صہیونیت کے بغیر محض جی نہیں سکتی بلکہ بہتر طور پر جی سکتی ہے۔

Anealla Safdar

ڈنمارک کے دارالحکومت کوپن ہیگن میں ایک ہفتے کی یخ بستہ صبح ایلان پاپے ایک سنیما ہال میں وارم اپ ہوئے۔ سیاہ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ایلان پاپے نے اُس کانفرنس کے منتظمین سے معیاری اور فصیح عربی میں گفتگو کی، جس سے وہ خطاب کرنے والے تھے۔ دوسرے اسرائیلیوں کے برعکس ایلان پاپے نے ''نوآبادیات والے لوگوں'' کی زبان سیکھی ہے۔ عربی میں مہارت پیدا کرنے کے لیے انہوں نے فلسطین میں قیام کیا۔ عربی کے رسمی اسباق لینے کے لیے وہ فلسطینی دوستوں میں گھرے رہتے تھے۔

غزہ میں فلسطینیوں پر اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں ڈھائی جانے والی قیامت کی مذمت میں منعقد کی جانے والی کانفرنس میں سیکڑوں اہلِ علم، حکام، بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ بنیادی حقوق کے لیے کام کرنے والے کارکنوں اور دوسرے بہت سے لوگوں نے شرکت کی۔ ان میں ڈنمارک کے وہ عام باشندے بھی شامل تھے جو غزہ کی صورتحال سے بہت خوفزدہ تھے۔ کانفرنس کا اہتمام یورپ فلسطین نیٹ ورک نے کیا تھا۔ ایلان پاپے نے کانفرنس سے خطاب کے دوران کہا کہ غزہ کے خلاف اسرائیلی جنگی کارروائیوں پر یورپ کا ردِعمل اُن کے لیے چونکانے والا رہا ہے۔ اسٹیج پر انہوں نے کہا کہ یورپ کی پوزیشن سے حیران ہوتے ہوئے میں نے یہ حیرانی بہت سوں کے ساتھ شیئر کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب کا ماڈل یا نمونہ ہونے کا دعویٰ کرنے والے یورپ نے حالیہ زمانوں میں قتلِ عام کے بڑے واقعات کو مجموعی طور پر نظر انداز کیا ہے۔

کانفرنس کے دوران قطر کے میڈیا نیٹ ورک ''الجزیرہ'' نے اسرائیل کے ۷۰ سالہ تاریخ دان، تجزیہ کار، مصنف اور مدرس (پروفیسر) ایلان پاپے کا انٹرویو کیا۔ اُن کی عمر کا بڑا حصہ فلسطینیوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے میں گزرا ہے۔ زیرِ نظر انٹرویو میں انہوں نے صہیونیت، یکجہتی اور امریکا میں بدلتے ہوئے منظرنامے کے غزہ پر اثرات پر گفتگو کی ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ انٹرویو تب لیا گیا تھا جب غزہ میں جنگ بندی کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●

الجزیرہ: آپ ایک زمانے سے کہہ رہے ہیں کہ صہیونیت کے لوازم میں (یہودی ریاست کے قیام کی خاطر قوم پرست سوچ اور سیاسی نظریے کے ساتھ ساتھ) زیادہ سے زیادہ زمین کا حصول اور وہاں بسے ہوئے لوگوں کو نکالنا بھی شامل ہے۔ گزشتہ پندرہ ماہ کے دوران غزہ نے یومیہ بنیاد پر غیر معمولی قتلِ عام کا سامنا کیا ہے۔ ہم صہیونیت کا کون سا مرحلہ دیکھ رہے ہیں؟

ایلان پاپے: ہم اُس مرحلے میں ہیں جسے نئی صہیونیت کہا جاتا ہے۔ صہیونیت کی پُرانی اقدار اب اور بھی شدید اور انتہا پسندانہ ہیں۔ صہیونیوں کی گزشتہ نسلیں جو کچھ طویل مدت میں حاصل کرنا چاہتی تھیں، وہی سب کچھ صہیونیوں کی نئی نسل بہت تیزی سے اور بہت کم وقت میں حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ کل کے صہیونی بہت کچھ پانا چاہتے تھے تاہم مرحلہ وار جبکہ آج کے صہیونی بے صبرے ہیں۔

صہیونیوں کی نئی قیادت کی کوشش ہے کہ جو کام انہوں نے ۱۹۴۸ء میں شروع کیا تھا، وہ مکمل کیا جائے یعنی تاریخی طور پر تسلیم شدہ فلسطین پر قبضہ کرکے اُس پر یہودی ریاست قائم کرنا اور اِن علاقوں سے زیادہ سے زیادہ فلسطینیوں کو نکال باہر کرنا اور پھر ایک ایسی صہیونی ریاست کا وجود یقینی بنانا جس سے تمام پڑوسی یا تو ڈریں یا اُس کا احترام کریں۔ اضافی کام یہ ہے کہ جب فلسطین کی تاریخی حدود میں صہیونی ریاست قائم اور مضبوط ہوجائے تو اُس کی توسیع بھی کی جائے یعنی ملحق علاقوں پر قبضہ کرکے اُنہیں گریٹر اسرائیل کا حصہ بنادیا جائے۔

تاریخ کے تناظر میں یہ بات میں قدرے احتیاط کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ یہ صہیونیت کا حتمی مرحلہ ہے۔ کسی بھی نظریاتی تحریک میں، پھر چاہے وہ نوآبادیاتی دور کے حوالے سے ہو یا پھر کسی سلطنت کی توسیع کے حوالے سے، بالعموم آخری مرحلہ انتہائی پُرتشدد ہوتا ہے اور اُس تحریک کے چلانے والے اپنی اُمنگوں کی تکمیل کے حوالے سے بہت پُرجوش اور بہت عجلت پسند دکھائی دیتے ہیں۔ وہ حد سے گزر جاتے ہیں اور پھر اِس کے بعد وہ گرتے ہیں اور سب کچھ ختم ہوتا چلا جاتا ہے۔

الجزیرہ: ہم ایک نئے سیاسی منظرنامے سے کچھ ہی فاصلے پر ہیں کیونکہ امریکا میں ڈونلڈ ٹرمپ دوسری بار صدر کی حیثیت سے حلف اٹھانے والے ہیں۔ وہ خود بھی بہت بڑھ چڑھ کر بولتے ہیں اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم ایکس کے مالک ایلون مسک بھی اُن کی ٹیم میں ہیں۔ ایلون مسک اسرائیلی پالیسیوں کو سراہتے نہیں تھکتے۔ اور اُس کی فوج کو بھی۔ آپ ٹرمپ کی صدارت کو اسرائیل پر کس حد تک اثرانداز ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں؟ کیا غزہ میں مکمل امن قائم ہورہے گا یا جنگ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہی رہے گی؟

ایلان پاپے: امریکی ایوانِ صدر میں ڈونلڈ ٹرمپ کی دوبارہ آمد اور ایلون مسک کے اُن کے ساتھ ہونے کی صورت میں کسی بھی مثبت تبدیلی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اسرائیل اور صہیونیت کا مستقبل امریکا کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمام امریکی ٹرمپ کے حامی اور مددگار ہیں۔ اور تمام امریکی ایلون مسک کے طرفدار اور مددگار بھی نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس بات پر بھی یقین رکھتا ہوں کہ اگلے دو یا تین سال میں کوئی بڑی مثبت تبدیلی واقع نہ ہوسکے گی۔

اچھی خبر یہ ہے کہ ٹرمپ جیسے عوام کو جذباتی کرنے والے لیڈر اور ایلون مسک جیسے ''خر دماغ'' زیادہ اہلیت کے حامل نہیں۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ساتھ امریکی معیشت کو بھی زوال سے دوچار کریں گے اور ساتھ ہی ساتھ عالمی برادری میں امریکا کی ساکھ مزید خراب کریں گے۔ اگر ایسے لوگ امریکا کی قیادت پر مامور ہوتے رہے تو نتائج امریکا کے لیے بہت بُرے ثابت ہوں گے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ صورتحال مستقبل میں مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کی کم از کم مداخلت کی نشاندہی کرتی ہے۔ امریکا کا عمل دخل کسی بھی خطے میں کم ہونا ایک مثبت پیش کیفیت ہے۔

ہمیں صرف مشرقِ وسطیٰ میں نہیں بلکہ پوری عرب دنیا میں بین الاقوامی مداخلت کی ضرورت ہے مگر یہ مداخلت جنوب کی طرف سے ہونی چاہیے نہ کہ شمال کی طرف سے۔ شمالی نصف کرّے نے جو کچھ کیا ہے، جو ورثہ چھوڑا ہے، اُس کی روشنی میں دنیا بھر میں کم ہی لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شمال نے ایک اچھے اور دیانت دار مصالحت کار کا کردار ادا کیا ہے۔ قلیل المیعاد بنیاد پر میں اس حوالے سے خوفزدہ ہوں۔ میری خواہش ہے کہ کاش میری رائے غلط ہو یا مجھے غلط سمجھا جائے۔ کچھ ہی مدت بعد جو تباہی رونما ہونے والی ہے، اُسے روکنے والی قوتیں مجھے دکھائی نہیں دے رہیں۔ اچھی خاصی تباہی ہماری منتظر ہے۔

وسیع تر تناظر میں سوچنے پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم انسانیت کے ایک بہت ہی بُرے اور بھیانک مرحلے یا باب کے آغاز پر نہیں بلکہ اختتام پر کھڑے ہیں۔

الجزیرہ: جنگ بندی کے لیے مذاکرات چل رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں فلسطین کو حقیقی امن سے مستفید و محظوظ ہونے کا موقع کب ملے گا؟

ایلان پاپے: میں نہیں جانتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری نظر میں جنگ بندی کا معاہدہ بھی، بدقسمتی سے، اختتام نہیں کیونکہ قتلِ عام بہت بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ خیر، مقامِ شکر ہے کہ اِس صورتحال کو روکنے والی نہ سہی تو اِسے ایک حد تک رکھنے والی طاقت ضرور میسر ہے۔ میں ایک ایسے دور کو چشمِ تصور سے دیکھ سکتا ہوں جو کم و بیش دو عشروں پر محیط ہو مگر ان کی کوششوں سے متعلق وہ دور مجھے اس وقت شروع ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ فلسطینی علاقوں سے یہودی آبادکاروں کو نکالنے کا عمل طویل ہوگا اور اس حوالے سے بہت کچھ جھیلنا بھی پڑے گا۔

کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہم تاریخ کے مطالعے کے ذریعے اِسے جان سکتے ہیں، سمجھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کو فلسطینیوں کے علاقوں سے نکالنا انتہائی پُرتشدد مرحلہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ اس کے بعد آنے والی انتظامیہ بہت اچھی ہو یا یہ کہ اس کے نتیجے میں بہتر حالات کی راہ ہموار ہو یا ایسی صورتحال جنم لے جس میں ہر فریق کے لیے فتح ہو اور نقصان کسی کا نہ ہو۔

الجزیرہ: فلسطینیوں اور بہت سے مبصرین کی نظر میں دنیا محض تماشا دیکھ رہی ہے جبکہ اسرائیل توسیع پسندی کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، اپنے پڑوسیوں پر حملے کر رہا ہے اور کسی بھی نوع کے مواخذے کے بغیر پوری آزادی سے قتلِ عام کر رہا ہے۔

ایلان پاپے: تاریخی اعتبار سے دیکھیے تو کسی بھی تحریک کا حتمی مرحلہ خاصا طویل ہوتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ایسا ہوگا یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کب ہوگا۔ اس میں وقت تو لگے گا۔

علاقائی اور عالمی سطح پر ایسی بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو اس مرحلے کے جاری رہنے کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔ ٹرمپ جیسے عوامی جذبات کی لہر پر سوار ہوکر ایوانِ اقتدار میں آنے والے سیاست دان، ملٹی نیشنل کارپوریشنز کی طاقت، فاشزم کی دوبارہ آمد، یورپ میں انتہائی دائیں بازو کا فاشزم، عرب دنیا میں کرپشن کی بڑھتی ہوئی سطح۔۔۔ یہ سب کچھ مل کر ایک ایسے عالمی اتحاد کو برقرار رکھنے کا سبب بن رہا ہے جو اسرائیل کو وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دیتا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک اور اتحاد بھی ہے جسے ایسی طاقت میسر نہیں تاہم وہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ یہ اتحاد ناانصافی کے خلاف کی جانے والی جدوجہد سے جُڑا ہوا ہے۔ اس وقت تو خیر ایسا ممکن نہیں مگر مستقبل بعید میں محض فلسطین پر توجہ مرکوز رکھنے والا نہیں بلکہ عالمی حرارت میں اضافے، افلاس، ترکِ وطن اور دیگر مسائل کے حوالے سے کوئی ایسا عالمی اتحاد ابھرے جو طاقتور بھی ہو یعنی ایک بڑی سیاسی قوت میں تبدیل ہو۔ اس دوسرے یا متوازی عالمی اتحاد کی ہر چھوٹی کامیابی صہیونی منصوبے کو اختتام کی طرف لانے میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔

الجزیرہ: اس متوازی عالمی اتحاد کو کیا کرنا ہے؟ اِس کے کاز کے لیے کون سی بات زیادہ معاون ثابت ہوسکتی ہے؟

ایلان پاپے: دو باتیں ہیں۔ ہمارے پاس ایسی کوئی تنظیم نہیں جو غیر معمولی ساکھ رکھتی ہو، تعاون کی حامل ہو، ناانصافی اور مظالم کے خلاف لڑنے کی توانائی رکھتی ہو۔ صہیونی منصوبے کو روکنے کے لیے بھرپور تنظیم درکار ہے۔ اس کے لیے جوان خون بھی درکار ہے۔ ہمیں ایسا بنیادی ڈھانچا لازمی طور پر درکار ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمیں یہ متقیانہ اور سادہ لوحی پر مبنی سوچ ترک کرنی ہے اور ایسے نیٹ ورک اور اتحاد تیار کرنے ہیں جو یہ بات سمجھیں کہ لوگ بعض بنیادی

معاملات پر اختلافِ رائے کا شکار ہوتے ہیں تاہم اُنہیں ساتھ لے کر چلنے کی صورت میں بھرپور کامیابی یقینی بنائی جاسکتی ہے اور غزہ کے لوگوں کو قتلِ عام سے بچایا جاسکتا ہے۔

الجزیرہ: آپ کا کہنا ہے کہ ایک مضبوط تر عالمی اتحاد صہیونیت کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور مضبوط بھی کررہا ہے۔ آپ نے یورپ میں تیزی سے ابھرتے انتہا پسند دائیں بازو کی بات بھی کہی۔ اِن میں یہودی مخالف جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔

ایلان پاپے: ایک ناپاک اتحاد شروع ہی سے موجود تھا۔ اگر منطقی اعتبار سے بات کی جائے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ صہیونیت پسند اور یہودیت مخالف عناصر کا مقصد یا ہدف ایک تھا۔ یہ لوگ یورپ میں یہودیوں کو دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہودیوں کو فلسطین میں دیکھنا اِن دونوں ہی قسم کے عناصر کا مشترکہ ہدف رہا ہو۔

اب یورپ میں ابھرنے والے انتہائی دائیں بازو اور اسرائیل کے درمیان خیالات کے اتحاد کا ایک نقطہ موجود ہے اور اِسے ہم اسلاموفوبیا کے نام سے جانتے ہیں۔

یورپ میں ابھرنے والے انتہائی بازو کے عناصر میں یہودیوں کے مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں تاہم اس وقت وہ بنیادی طور پر مسلم اور عرب کمیونٹیز کو نشانے پر لیے ہوئے ہیں۔ فی الحال یہ لوگ یہودیوں کو نشانہ نہیں بنا رہے۔ یورپ کے انتہائی دائیں بازو کے لوگ اس وقت یہودیوں کو سب سے بڑی اسلام مخالف اور عرب مخالف قوت کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ یہودی اگر اسرائیل سے باہر ہوئے تو ایسے کسی بھی اتحاد کا حصہ بننے پر صرف پچھتائیں گے۔ اس وقت یورپ میں آباد جو یہودی اسرائیل کے حامی ہیں، وہ بھی بیک وقت اسرائیل اور نازی ازم کے پرچم لہرانے میں خاصی بے چینی محسوس کرتے ہیں۔

میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ اب یورپ میں آباد یہودی بھی اسرائیل سے اپنے تعلق پر نظرثانی کرنا چاہیں گے۔ ہمیں اس حوالے سے علامات دکھائی بھی دے رہی ہیں۔ امریکا میں آباد یہودیوں کی نئی نسل اس حوالے سے بہت نمایاں ہے۔ انہیں بہت شدت سے یہ محسوس ہورہا ہے کہ اسرائیل ایک بڑے عالمگیر سیاسی اتحاد (یا ایجنڈے) کا حصہ ہے اور خود کو اُس کے آئینے میں دیکھا نہیں جاسکتا۔

اس وقت اسرائیل کو ٹرمپ جیسے بڑبولے سیاست دانوں کی بھرپور حمایت حاصل ہے جو اُتھلے پانیوں جیسے عوامی جذبات کی لہر پر سوار ہیں۔ پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اسرائیل کو اس نوعیت کی حمایت مستقبل میں حاصل نہیں ہوسکے گی۔

الجزیرہ: غزہ میں جو قتلِ عام ہوا ہے، اس نے بعض یہودی گروپوں سمیت بہت سوں کو اسرائیل کے قیام اور فلسطینیوں کی نسلی تطہیر کے بارے میں سوچنے کی راہ سُجھائی ہے۔ آپ نے اس قضیے کی تفہیم کی بنیاد پر خاندانوں کو منقسم ہوتے دیکھا ہے؟

ایلان پاپے: اسرائیل میں تو ایسا نہیں ہے مگر ہاں، اسرائیل سے باہر جو یہودی آباد ہیں، اُن میں یہ تبدیلی ضرور رونما ہوئی ہے۔

غزہ کے حوالے سے دنیا بھر کے میڈیا آؤٹ لیٹس نے جو خبریں دی ہیں، جو وڈیوز منظرِ عام پر آئی ہیں، اُن سے غیر اسرائیلی یہودیوں کی نئی نسل کسی بھی طور لاتعلق نہیں رہ سکتی۔ اگر ان کی تعلیم و تربیت یہودیوں کی روایات کے مطابق کی گئی ہے تب تو اُنہیں غزہ میں اسرائیلی فوج کے مظالم زیادہ واضح طور پر دکھائی دیں گے۔

غزہ کا قضیہ بہت حد تک نسلوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ نئی نسل بہرحال زیادہ معلومات کے حصول کی بدولت اس قضیے کی نوعیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے اور اُس سے مثبت سوچ کی توقع کی جاسکتی ہے۔

الجزیرہ: اسرائیل میں بھی تو نئی نسل کو سوشل میڈیا پورٹلز کے ذریعے غزہ کے وسیع تر قتلِ عام کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل ہیں۔ ٹک ٹاک جیسے پلیٹ فارمز کے ذریعے بھی تو بہت کچھ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ اسرائیلیوں کی نئی نسل غزہ میں قتل و غارت کے حوالے سے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتی، اُسے مکمل طور پر غلط سمجھنے سے گریز کرتی ہے؟

ایلان پاپے: اسرائیل میں یہودیوں کی نئی نسل کو وہ تعلیم نہیں ملتی جو امریکا میں یہودیوں کے بچوں کو ملتی ہے۔ اسرائیلی بچے ایک ایسے ملک میں تعلیم حاصل کررہے ہیں جو ایک خاص نظریے کی چادر اوڑھے ہوئے ہے۔ یہی اس مسئلے کی بنیاد ہے۔ اسرائیل کی نئی نسل کو اسرائیلی نظامِ تعلیم نے پیدا کیا ہے، انجینئرڈ کیا ہے۔

میں نے ۱۹۹۹ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ موجودہ اسرائیلی نصابِ تعلیم کا جائزہ لے کر یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اگلی نسل کے گریجویٹ انتہائی نوعیت کے جنونی نسل پرست ہوں گے اور دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی انتہائی خطرناک ہوں گے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ میری رائے بالکل درست ثابت ہوئی۔ امریکا میں اس وقت جو نئی نسل پائی جاتی ہے، وہ ایک ایسے معاشرے کی پیداوار ہے جسے ایک خاص نظریے کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ اسرائیل میں ماں کی گود سے قبر تک ایک خاص نظریاتی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ سلسلہ کسی وقفے کے بغیر جاری ہے۔

اسرائیل میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیمی بنیادیں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ محض تصویریں اور وڈیوز وغیرہ دکھا کر آپ اس نسل کو سوچنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ اسرائیل کے نوجوان فلسطینی بچوں کی لاشیں دیکھ کر کہہ سکتے ہیں بہت اچھا، شاباش۔ انسانیت سے محرومی اسرائیلی ڈی این اے کا حصہ ہے۔ محض سمعی و بصری معلومات کے ذریعے اسرائیلیوں کے دل بدلے نہیں جاسکتے۔

(مترجم: ایم ابراہیم خان)

"Israeli historian Ilan Pappe:
'This is the last phase of Zionism'."
("Al Jazeera". January 14, 2025)

بقیہ: مودی سرکار کے لیے نیا دردِ سر

کی درخواست بالعموم چار سال میں مثبت نتیجے تک پہنچتی ہے۔ تاخیر بھی اگر ہوتی ہے تو زیادہ سے زیادہ تین سال کی یعنی سیاسی پناہ کی درخواست دینے والے زیادہ سے زیادہ سات سال میں امریکا کے ہورہتے ہیں۔ اگر ڈونلڈ ٹرمپ نے قوانین کی ترمیم کے ذریعے غیر قانونی تارکینِ وطن کے معاملات تیزی سے نپٹائے اور بھارت سے تعلق رکھنے والے غیر قانونی تارکینِ وطن کو بڑی تعداد میں وطن واپس بھیجا گیا تو مودی سرکار کے لیے بہرحال اچھا خاصا دردِ سر پیدا ہوگا اور اُسے شدید سیاسی دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

(مترجم: ابوصباحت)

"Illegal immigrants | The new American nightmare". ("India Today". January 20, 2025)

محققین اور تشنگانِ علومِ اسلامیہ کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ
برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ
سہ ماہی ''تحقیقاتِ اسلامی'' علی گڑھ
کے ۴۳ برسوں پر مشتمل
اشاریہ
قیمت: ۱۵۰۰ روپے (۵۰ فیصد رعایت)
حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے
اکیڈمی بُک سینٹر
فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰، ۰۳۳۴-۳۹۱۲۷۶۹

امریکا کو قانونی تارکینِ وطن کا انتظار

Karishma Saurabh Kalita

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا بھر کے باصلاحیت نوجوان عملی زندگی میں زیادہ سے زیادہ ترقی اور خوشحالی یقینی بنانے کے لیے امریکا، کینیڈا، یورپ، جاپان، جنوبی کوریا، آسٹریلیا اور دیگر ترقی یافتہ یا خوشحال ممالک میں کام کرنے اور وہاں مستقل طور پر آباد ہونے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔

امریکا اور یورپ کا رُخ کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دنیا بھر میں ہر سال لاکھوں افراد کسی نہ کسی طور امریکا، یورپ یا کینیڈا پہنچنے کی تگ و دَو کرتے ہیں۔ بیشتر کا حال یہ ہے کہ غیر قانونی طریقوں سے اِن ممالک یا خطوں تک پہنچنے کے لیے خطیر رقوم خرچ بھی کرتے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں غیر قانونی تارکینِ وطن کو پہلے تو صرف ناپسند کیا جاتا تھا، اب اُن سے نفرت بھی عام ہو چکی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ غیر قانونی تارکینِ وطن میں اکثریت بالکل ناخواندہ یا کم پڑھے لکھے اور غیر ہنرمند لوگوں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ معاشرے کا حصہ بننے میں بہت وقت لیتے ہیں۔ ناخواندہ، کم پڑھے لکھے اور غیر ہنرمند غیر قانونی تارکینِ وطن ورک فورس کا معقول حصہ نہیں بن پاتے جس کے نتیجے میں معاشرتی سطح پر بھی غیر معمولی نوعیت کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے انتخابی مہم کے دوران جس بنیادی نکتے پر ووٹرز کی اکثریت کی توجہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی، وہ نکتہ تھا غیر قانونی تارکینِ وطن سے نجات۔ صدر ٹرمپ نے صاف کہہ دیا تھا کہ غیر قانونی تارکینِ وطن کو ملک بدر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جائے گا اور اگر ان کی ملک بدری کے لیے طاقت استعمال کرنا پڑی تو ایسا کرنے سے بھی گریز یا دریغ نہیں کیا جائے گا۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے دوسری مدت کے لیے امریکی صدر کا منصب سنبھالتے ہی غیر قانونی تارکینِ وطن اور سرکاری ملازمین کو نشانہ بنانے والے ایگزیکٹیو آرڈرز جاری کر دیے ہیں۔ پیدائش کی بنیاد پر شہریت کا حق ختم کرنے کے لیے بھی ایگزیکٹیو آرڈر جاری کیا گیا ہے۔ یہ ایگزیکٹیو آرڈر اجرا کے لمحے سے ہی متنازع ٹھہرا ہے اور اِس کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی ڈیموکریٹس اور بنیادی حقوق کے علم بردار گروپوں نے شروع کر دی ہے۔

امریکا تارکینِ وطن کے حوالے سے کیا چاہتا ہے؟ صدر ٹرمپ نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ صدر کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنی پہلی پریس کانفرنس میں انہوں نے کہا کہ امریکا کو دنیا بھر سے قابل ترین افراد کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ افرادی قوت کے لیے امریکی حکومت ایچ ون بی ویزا جاری کرتی ہے۔ اس ویزا کے اجرا کے ذریعے امریکا کو دنیا بھر کے پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک سے غیر معمولی صلاحیت و سکت کے حامل افراد کی خدمات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ لوگ امریکا کی ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

امریکا میں ایچ ون بی ویزا کے حوالے سے جاری بحث کے حوالے سے ڈونلڈ ٹرمپ کہتے ہیں کہ میں اِس کے حق میں اور مخالفت میں دلائل دینے والوں سے متفق ہوں مگر جھکاؤ تو اِس کے حق میں بولنے والوں کی طرف ہے کیونکہ میں اس بات کے حق میں ہوں کہ دنیا بھر سے باصلاحیت، ہنرمند، تربیت یافتہ، مہذب اور پُرجوش نوجوانوں کو امریکا آنا ہی چاہیے۔ دنیا بھر میں باصلاحیت افراد کی تلاش جاری ہے اور ترقی یافتہ ممالک اس حوالے سے بہت فعال ہیں۔ صرف امریکا نہیں بلکہ دیگر ترقی یافتہ ممالک اور خطے چاہتے ہیں کہ دنیا بھر سے باصلاحیت افراد (بالخصوص نوجوان) اُن کا رخ کریں اور اپنی صلاحیت و سکت سے ترقی و خوشحالی میں کلیدی کردار ادا کریں۔

وائٹ ہاؤس میں منعقد ہونے والی صدر ٹرمپ کی (دوسری میعاد کی) پہلی پریس کانفرنس کے موقع پر اوریکل کے سی ٹی او لیری ایلیسن، سوفٹ بینک کے سی ای او ماسایوشی سن اور اوپن اے آئی کے سی ای او سیم آلٹمین بھی موجود تھے۔

صدر ٹرمپ کا کہنا تھا کہ امریکا کو دنیا بھر سے پڑھے لکھے اور پُرجوش نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ اگر وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت یافتہ اور ہنرمند بھی ہوں تو اچھا ہے۔ اگر تھوڑی بہت تربیت کا اہتمام کرنا بھی پڑے تو یہ کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ دوسرے ماحول میں پل کر جوان ہونے والوں کو امریکا کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے میں کچھ وقت تو لگنا ہی چاہیے۔

امریکا میں ایچ ون بی ویزا کے حوالے سے بڑے پیمانے پر اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ صدر ٹرمپ کے قریبی ساتھی اور ارب پتی آجر ایلون مسک ایچ ون بی ویزا کے اجرا کے حق میں ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے امریکا کو معیاری افرادی قوت آسانی سے ملتی ہے۔ دوسری طرف بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ ایچ ون بی ویزا کے ذریعے دنیا بھر سے تعلیم یافتہ اور ہنرمند افراد کی آمد سے امریکیوں کی ملازمتیں خطرے میں پڑتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ملک کے اصل باشندوں میں بے روزگاری کا گراف بلند ہوتا ہے۔ دونوں کی طرح کے دلائل اپنی جگہ بہت حد تک درست ہیں تاہم امریکا کو چونکہ معیاری افرادی قوت کی ضرورت بہت زیادہ ہے، اس لیے ایچ ون بی ویزا کے اجرا کا سلسلہ جاری رکھنا لازم ہے۔

صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ امریکا کو چونکہ باصلاحیت، تربیت یافتہ اور مہذب افراد کی بڑے پیمانے پر ضرورت ہے، اس لیے میں چاہوں گا کہ ایچ ون بی ویزا کا اجرا بند نہ ہو، دنیا بھر سے باصلاحیت افراد کو امریکا آنے دیا جائے۔ اُن کا کہنا تھا کہ امریکا کو ایسی افرادی قوت چاہیے جو باصلاحیت اور محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ مہذب بھی ہو اور معاشرے میں آسانی سے مطابقت پیدا کر سکے۔ ہمیں اپنے کاروباری اداروں کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو معیار پر سمجھوتا نہ کریں، اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طور پر بروئے کار لائیں اور جہاں تک ممکن ہو، معیار محض برقرار نہ رکھیں بلکہ بلند بھی کریں۔

ایچ ون بی ویزا عارضی نوعیت کا ہوتا ہے تاہم یہ اُن افراد کو دیا جاتا ہے جو اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتہ اور ہنرمند ہوں۔ امریکا کے جاری کردہ ایچ ون بی ویزا کا ۷۰ فیصد اس وقت بھارتی باشندوں کے حصے میں آتا ہے۔ ایچ ون بی ویزا کے ذریعے کوئی بھی غیر ملکی امریکا میں ۶ سال تک رہ سکتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ویزا ۳ سال کے لیے جاری کیا جاتا ہے۔ بعد میں اِسی میں اِتنی ہی مدت کی توسیع کروائی جا سکتی ہے۔ جو لوگ ایچ ون بی ویزا کے لیے درخواست جمع کراتے ہیں، اُنہیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ درخواست جمع کرانے کے بعد ویزا کے اجرا تک کسی بھی ملک کا سفر نہ کریں۔

صدر ٹرمپ کی طرف سے انتخابی مہم کے دوران غیر قانونی تارکینِ وطن کو بڑے پیمانے پر ملک بدر کرنے کے اعلان کے بعد سے ایچ ون بی ویزا کے حوالے سے بحث بھی زور پکڑ گئی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے صدر کا منصب دوبارہ سنبھالتے ہی چند ایگزیکٹیو آرڈر جاری کیے ہیں۔ ایک ایگزیکٹیو آرڈر کے ذریعے میکسیکو سے ملنے والی جنوبی سرحد پر ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے۔ صدر ٹرمپ نے ڈرگ مافیا کو بھی دہشت گردی تنظیموں کی

باقی صفحہ نمبر ۹

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950